عام شمارہ
₹ 80
www.urdubookreview.in
ISSN 0971-9288

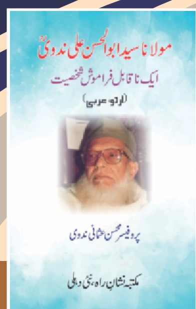

اردو بک ریویو

جنوری - فروری - مارچ 2026

انصاف ظالموں کی حمایت میں جائے گا یہ حال ہے تو کون عدالت میں جائے گا

— راحت اندوری [آمد: یکم جنوری 1950 — رخصت: 11 اگست 2020]

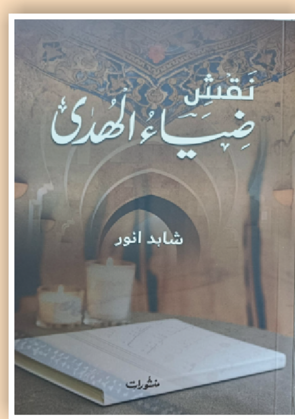

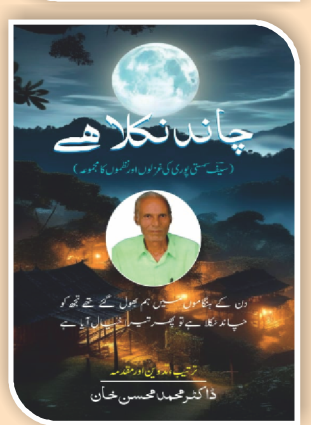

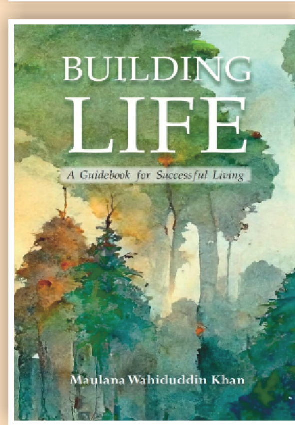

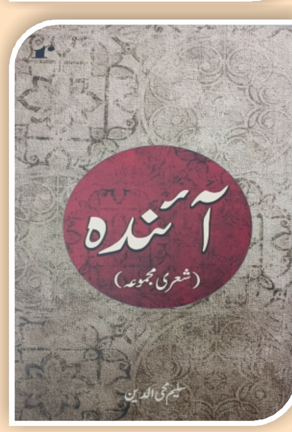

ایک اپیل ایک اعلان اور تعارف

آپ کی خصوصی توجہ کا سب سے زیادہ مستحق

مسلم لڑکیوں کا یتیم خانہ گیا

40 سالہ خدمات

کیفیت قیام ادارہ کا تین (۳) یتیم لڑکیوں سے ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو ایک کرایہ کے کھپریل مکان میں قیام عمل میں آیا تھا۔ جو کبھی سانپ، بچھو اور چڑیوں کا بسیرا تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ ۔ عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کہسار۔

ہندوستان کی ریاست بہار، جھارکھنڈ، بنگال، اُڑیسہ (اُڈیشہ) میں اپنے طرز کی پہلی اور واحد اقامتی (Residential) دینی و عصری علوم کی مشہور تعلیم گاہ جو اسلامی اور عصری علوم کا سنگم ہونے کی وجہ کر مشہور ہے۔ ● ادارہ بنیاد کے دن سے ہی صحیح اسلامی خطوط پر یتیم کے ساتھ ساتھ غریب اور غیر یتیم طالبات کی تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ● یہاں کی طالبات کو میٹرک (Matric) پاس کرنے کے بعد کالج کے علاوہ عربی یونیورسیٹی میں سال اوّل و دوم میں بآسانی داخلہ مل جاتا ہے۔ ● شعبۂ حفظ کی طالبہ کو بھی حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک (Matric) تک پڑھایا جاتا ہے۔ ● پانچ زبانوں میں مع قرآن واسلامیات اور بہار بورڈ کے نصاب تعلیم کے ساتھ معیاری تعلیم کا نظم ہے۔ ● **تعلیمی سال** اپریل تا مارچ ● ادارہ کے احاطہ (Campus) میں ہی پردہ (Purdah) میں رہ کر درجہ نرسری (Nursery) تا میٹرک (Matric) تک کی تعلیم مع ہوم سائنس (امور خانہ داری) سلائی کٹائی، مہندی و پینٹنگ اور کمپیوٹر کی تعلیم وغیرہ دی جاتی ہے۔ اس لئے بچیوں کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا۔ **تعلیمی مراحل** ابتدائی ● ثانوی ● اعلیٰ ● شعبہ حفظ **تعداد یتیم طالبات** 75 **نوٹ** یتیم طالبات کا سارا خرچ مع طعام وقیام ورہائش وغیرہ بالکل مفت (Free) کسی چیز کا کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ **تعداد بیرونی طالبات** اپنے خرچ پر دارالاقامہ (Boarding) میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والی اور دوسرے گاؤں سے پڑھ کر جانے والی تقریباً 100 ہیں۔ **کفالہ اسکیم (Sponsorship)** کے تحت ایک یتیم بچی کا سالانہ خرچ تیس ہزار (Rs 30,000/=) روپے ہے۔ آپ بھی ایک یتیم بچی کی کفالت کا بار اٹھا کر کار ثواب میں شریک ہوں۔ **تعداد اساتذہ و معلمات اور دیگر ملازمین** 30 تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کی ایک ماہ کی تنخواہ ایک لاکھ اسّی ہزار (Rs1,80,000) روپے سے زائد ہے۔ **سالانہ خرچ** تقریباً پینتالیس لاکھ (Rs 45,00,000/=) روپے **ذریعہ آمدنی** مسلم عوام کے چندے **اپیل** آج کے مادہ پرستانہ اور جدید دور میں لڑکیوں کے لیے جدید اور مکمل اسلامی طرز تعلیم کے ساتھ رہائشی (Residential) اداروں کی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر ضرورت ہے۔ ● آپ اس آسمان چھوتی گرانی کو دیکھتے ہوئے اور ماہ رمضان المبارک کے مبارک موقع پر ادارے کی ننھی منی معصوم یتیم بچیوں کو اونچا اٹھانے کے لیے اپنے ● زکوٰۃ ● عطیات ● صدقات سے بھر پور مالی مدد کریں تاکہ وہ تعلیم اور ہنر کے میدان میں آگے بڑھ سکیں اور کسی سے پیچھے نہ رہیں ● باقی تعمیری و تعلیمی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے رقم کی فوری ضرورت ہے ● ادارہ آپ کے فراخدلانہ اور مخلصانہ بھر پور مالی تعاون کا منتظر ہے۔ **یاد رکھیں** یہ لڑکیوں کا ادارہ ہے۔ یہاں چندہ وصول کرنے والوں کی بہت کمی ہے۔ یہاں کا کوئی بھی محصل کمیشن (اجرت) پر چندہ وصول نہیں کیا کرتا ہے۔

نوٹ ادارہ کی مختصر تاریخ دستاویزی (Documentary Film) فلم نذرعنایت (Nazr-e-Enayeth) You Tube

چیک وڈرافٹ اورکوربینکنگ سلپ پرصرف یہ لکھیں: THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGAE

برائے رابطہ چیک وڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ ●Founder & Hon. G. Secretary,THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE
At: Kolowna, P.o: Cherki-824237, Distt: Gaya (Bihar) India
●Email:thegayamuslimgirlsorphanage@gmail.Com ● Website: www.gmgo.in 8969435151

Beneficiary Name: THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

Bank A/C No.: 300402010007752 (Zakath) زکوٰۃ
Bank A/C No.: 300402010009846 (Donations) عطیات و تعمیرات
Bank IFSC Code No.: UBIN0530042
Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH GAYA)

Scan & Pay

نوٹ: بینک میں رقم ٹرانسفر کی تفصیل برائے مہربانی اسکین اینڈ پے (Scan & Pay) یا کسی ذریعہ سے رقم ٹرانسفر کے بعد اسکرین شاٹ (Screen Shot) مع نام و پتہ وہاٹس ایپ نمبر پر وہاٹس ایپ کردیں تاکہ رسید بھیجی جاسکے۔

وہاٹس ایپ نمبر 7367909126 بانی واعزازی جنرل سکریٹری اقبال احمد خاں 9934480190

پٹنہ برانچ آفس پٹنہ شہر کے ہمدردان یتامیٰ اپنا چیک وڈرافٹ اور رقم دینے کے لئے ان سے رابطہ قائم کریں۔

جناب غلام محمد خاں (صدر) سمن پورہ، پٹنہ۔: 9934943229 جناب انجینیر محمد حسنین خاں۔ سمن پورہ، پٹنہ: 9631867066

Website: www.urdubookreview.in

سہ ماہی

اردو بک ریویو

ISSN 0971-9288

URDU BOOK REVIEW

جلد: XXXII شمارہ: 45 جنوری، فروری، مارچ: 2026

شعبان المعظم، رمضان المبارک، شوال المکرم ۱۴۴۷ ھجری

مدیر

محمد عارف اقبال

مدیر اعزازی

ڈاکٹر سید تنویر حسین

سرکولیشن مینیجر

ندیم عارف

Mobile: 9953067664

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر شمس بدایونی (بریلی) ☆ اے۔یو۔آصف (نئی دہلی)

☆ شفیق الرحمٰن (نئی دہلی) ☆ طاہر نقوی (نوئیڈا، NCR)

☆ سعید اختر اعظمی (ریاض، سعودی عرب)

مجلس مشاورت

☆ کاشف الہدیٰ (USA) ☆ رضوان احمد فلاحی (لندن)

☆ پروفیسر خالد محمود (نئی دہلی) ☆ ادریس احمد خاں (دہلی)

☆ ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع (انڈیانا، USA)

☆ محمد معین الدین حبیبی (سابق اسسٹنٹ رجسٹرار، JMI، نئی دہلی)

☆ عارف محمود انصاری (مسقط، عمان)

☆ شاہ حسین نہری (اورنگ آباد، مہاراشٹر)

☆ احمد ابوسعید (حیدرآباد) ☆ سلمان غازی (ممبئی)

☆ ڈاکٹر سید احمد خاں (نئی دہلی) ☆ پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی)

☆ انتخاب عالم انصاری (ممبرا، تھانے)

☆ عبدالرحمٰن صدیقی (ممبئی) ☆ اعزاز حسن (دہلی)

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس

Under UGC Care List

Member, Press Club of India, New Delhi

قیمت

عام شمارہ (اسٹینڈ قیمت)	:	80/-
سالانہ (عام بذریعہ سادہ ڈاک)	:	300/-
سالانہ (عام اسپیڈ پوسٹ)	:	600/-
سالانہ (کتب خانے و ادارے)	:	750/- (اسپیڈ پوسٹ)
تاحیات (ہندوستان)	:	7000/-
بیرون ملک	:	35 امریکی ڈالر (سالانہ)
	:	500 یو ایس ڈالر تاحیات

آن لائن رقم ٹرانسفر کرنے کے لیے

Mohammad Arif Iqbal

Current A/c No. 33469561425

State Bank of India, Jama Masjid Delhi

IFSC: SBIN0002366

بینک ڈرافٹ یا ملٹی سٹی چیک پر صرف

"URDU BOOK REVIEW"

تحریر کریں۔

Registered Office

URDU BOOK REVIEW

1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel

Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

ترسیل زر اور ادارتی و انتظامی امور میں رابطے کا پتہ

2878, Ist Floor, Gali Captain Wali

Kucha Chellan, Darya Ganj

New Delhi-110002 Ph: [O] 011-44753890

[M] +91 9953630788 +91 9899506816

Email: urdubookreview1995@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ: اردو بک ریویو، ڈی ٹی پی ڈویژن

کمپوزیٹر: محمد عمران

Printer, Publisher and Editor: Mohammad Arif Iqbal

پرنٹر، پبلشر اور اونر محمد عارف اقبال نے اصیلا آفسیٹ پرنٹرز، 08-1307، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے چھپوا کر دفتر اردو بک ریویو، 1739/3، (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ: • ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا 03-04

عرضِ ناشر: مایوسی میں ہلاکت ہے اور اُمید میں شِفا 05

قارئین کے تاثرات 07-08

بلا تبصرہ: مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی 09-11
چمن کا دیدہ ور (پیش گفتار)

علم وادب: میاں مَرد بنو مَرد! 13-14
احمد حاطب صدیقی [ابونثر]

کتاب زندگی 15-18
• پروفیسر محمد نعمان خان (بھوپال) 15
• پروفیسر ضیاءالدین ملک فلاحی (علی گڑھ) 16
• سیّد منصور آغا (نئی دہلی) 17
• پروفیسر مظہر احمد (نئی دہلی) 18

سیر حاصل: (مفصّل تبصرہ) 19-22
• نقش ضیاءالہدیٰ 19

انگریزی کتاب: (نقد و تبصرہ) 23-27
• شاہد صدیقی کی خودنوشت کا تنقیدی جائزہ 23
• تعمیر حیات کے زرّیں اصول 25

نقد و تبصرہ 29-58
• لایموت: ایک خودنوشت 29
• یہ نصف صدی کا قصہ ہے (خودنوشت، صحافت کے پچاس سال) 32
• یہ میں ہوں (خودنوشت سوانح) 35
• دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات 36
• ڈیجیٹل میڈیا اور اردو زبان و ادب 38
• اوراقِ گم گشتہ محشر 41
• تاریخ انصاریان (تذکرہ علما و فضلا خاندان انصاری کشمیر) 43
• ذکر حیات (صوفی ابوالمعالم خاں) 44
• ماہنامہ چہارسُو، راولپنڈی (گوشہ ڈاکٹر مشتاق اعظمی) 46
• گل افشانیاں (طنز و مزاح) 49
• نقوشِ پندار (منتخب علمی، ادبی و تجزیاتی مضامین) 50
• شکیل الرحمٰن کے افسانے (کتابی سلسلہ ادراک، گوپال پور) 52
• کوچۂ عزیزاں (خاکے) 54
• سمندر پر ایک اُڑان (افسانے) 56
• اخلاق اثر بنام شکیل اعجاز 57

جائزہ: اردو کتب و رسائل 59-62
• سیّد لطیف الرحمٰن (مونوگراف) 59
• تذکرہ شعرائے ناگور 60
• طرز بیاں اپنا (مضامین خاکہ نما اور خاکے) 60
• ماہنامہ 'اردو آنگن' ممبئی (خصوصی شمارہ، حافظ عمادالدین ...) 61

شعری ادب: (مجموعہ کلام) 63-70
• چاند نکلا ہے (کلیات سیفی سمستی پوری) 63
• آئندہ (سلیم محی الدین) 65
• پنسل کے نشان (ڈاکٹر معظم عزم) 66
• شہر غزل (ڈاکٹر شفیق اعظمی) 68
• رنگ سخن (ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی) 69

یاد رفتگاں: 71-73
• اردو میں اقدار پر مبنی صحافت کے امین: پرواز رحمانی 71

خراج عقیدت: آیت اللہ علی خامنہ ای 74

وفیات [Obituaries]: 75-94
• سیّد شاہد مہدی (75) • پروفیسر محمد ذاکر (76)
• ڈاکٹر منظور احمد (77) • ڈاکٹر محمد منظور عالم (78)
• جیلانی بانو (80) • شیخ ذوالفار احمد نقشبندی (81)
• طاہر فراز (81) • رئیس انصاری (82)
• کرشن کمار طور (83) • اسد رضا (84)
• راج کماری اندرا دیوی (85) • پروفیسر احمد رضا صدیقی (86)
• احمد رشید شروانی (86) • جتیندر بِلّو (87)
• ابوالخیر نشتر (87) • سیّد احمد وصی رضوی (88)
• رشید عباس (90) • شیوراج پاٹل (91)
• مارک ٹلی (91) • قیوم کنول (92)
• سیّد صادق رضوی (92) • علی عباس رضوی (93)
• احمد اقبال (93) • سیّد اعتبار حسین ساجد (93)
• پیام سعیدی (94) • اسلم دہلوی (94)

نئی کتب: [New Arrivals] 95-96/73

مضمون نگار یا مبصر کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

علامہ محمد اقبال (9 نومبر 1877 — 21 اپریل 1938) کے انتقال کو تقریباً 88 برس ہونے کو ہیں۔ وہ متحدہ ہندوستان کے مایہ ناز سپوت تھے۔ انہوں نے تاحیات انسانیت کی پاسداری کی۔ ان کی ابتدائی تعلیم ہندوستان کے اسکاچ مشن کالج (سیالکوٹ) اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کی اعلیٰ تعلیم انگلینڈ اور جرمنی میں مکمل ہوئی۔ وہ اپنے دور کے عظیم فلاسفر، مفکر اور شاعر تھے۔ یہ وہی اقبال تھے جن کی دو شاہکار نظمیں 'پرندے کی فریاد' اور 'ترانہ ہندی' زبان زد عام ہوئیں۔ 'پرندے کی فریاد' لکھ کر انہوں نے دنیا کو 'جانوروں کے حقوق' کی طرف متوجہ کیا۔ اسی طرح وطن عزیز کے لیے 'ترانہ ہندی' پیش کر کے متحدہ ہندوستان کے عوام کو 'دیش پریم' کا درس دیا، جس کے ہر شعر کو آج بھی ہندوستان کا ہر فرد اپنے قلب میں طمانیت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اردو کے معروف شاعر تلوک چند محروم کے صاحبزادے ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد (1918-2004) کی ادبی شناخت ماہر اقبالیات کی ہے۔ وہ اقبال کے شیدائی تھے۔ اردو شاعری میں علامہ اقبال نے رام چندر جی، گرونانک جی اور گوتم بدھ پر بھی شاہکار نظمیں لکھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں امن کا پیغام دینے والے گوتم بدھ کے پیروؤں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ علامہ اس انسانیت سوز واقعہ پر کہتے ہیں:

قوم نے پیغام گوتم کی، ذرا پروانہ کی قدر پہچانی نہ، اپنے گوہر یک دانہ کی

علامہ اقبال ایسے دانشور اور فلسفی تھے جن کے دل میں ساری دنیا کے مظلوم انسانوں کے لیے درد تھا۔ وہ پوری انسانیت کی فلاح کے خواہاں تھے۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور خاکِ وطن ہی میں ان کو سپرد لحد کیا گیا۔ اگر ان کا مزار 'پاکستان' کے حصے میں آیا اور 'پاکستان' نے علامہ کو 'حکیم الامت' قرار دیا تو یہ معاملہ خالصتاً سیاسی ہے۔ علامہ اقبال کو خبر نہیں کہ مسلم قوم تقسیم ہو کر ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک کر رہی ہے۔ ہندوستان میں علامہ اقبال کو 'نظریہ پاکستان' کا خالق سمجھنا نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک دور رس انسان اور بلند پایہ دانشور و مفکر تھے۔ ان کی نظر نہ صرف ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت پر تھی بلکہ وہ دنیا کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے انڈین نیشنل کانگریس سے منسلک بعض سیاسی شخصیات کے خیالات سے علامہ بخوبی واقف تھے۔ 1925 میں آر ایس ایس کے قیام اور متحدہ ہندوستان میں مسلم قوم کے خلاف جو سازشی ذہن کام کر رہا تھا، علامہ اس کے پس منظر سے آگاہ تھے۔ وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ 1915 میں 'ہندو مہاسبھا' کی بنیاد مدن موہن مالویہ نے کیوں رکھی تھی جو انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سے زائد بار صدر رہ چکے تھے۔ بعد میں یہی 'ہندو مہاسبھا' ایک مختلف جماعت کی شکل میں 1930 کی دہائی میں اُبھری جس کے کلیدی رہنما ونائک دامور ساورکر تھے۔ چند دیگر کٹر قسم کے ہندو رہنماؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف جو منصوبہ پک رہا تھا، علامہ کی دور رس نگاہیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ایک مفکر اور دانشور کی حیثیت سے ہندو مسلم طبقے کو دیے گئے چند خیر خواہانہ مشورے کے منفی اثرات کو بھی علامہ اقبال نے شدت سے محسوس کیا تھا۔ علامہ

اقبال کے بارے میں شدت پسند ہندو رہنماؤں کی جانب سے جس طرح کے منفی اور غیر سنجیدہ پروپیگنڈے کیے گئے، اس سے وہ مسلسل کرب میں مبتلا رہے۔ بالآخر علامہ اقبال ہندوستانی قوم سے مایوس ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ علامہ کو ادراک ہو گیا تھا کہ ان کے 'ترانہ ہندی' کو سمجھنے والا شاید اب کوئی نہیں ہے۔ اسی کرب کے ساتھ وہ 21 اپریل 1938 کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ علامہ اقبال کا انتقال چند فرقہ پرست ہندو رہنماؤں کے نزدیک ایک توانا ستون گرنے کے مترادف تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ 'آزادی کے نام پر' جو کچھ ہوا، اسے ہندوستان کی تاریخ کا تاریک اور بدترین باب ہی کہا جا سکتا ہے۔

آزاد ہندوستان میں اس وقت آر ایس ایس کی سرپرستی میں بھارتیہ جنتا پارٹی برسر اقتدار ہے۔ آر ایس ایس کے موجودہ سرسنگھ چالک موہن بھاگوت (پ:1950) مارچ 2009 سے سنگھ پریوار کی قیادت کر رہے ہیں۔ برسر اقتدار نہ ہونے کی صورت میں 2014 سے قبل 'ہندتو کے عزائم' بظاہر غیر فعال نظر آتے تھے لیکن اقتدار کے حصول کے بعد پورے ملک میں اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے خلاف جو ظالمانہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کی جان و مال اور املاک پر نہ صرف حملے ہو رہے ہیں بلکہ بڑی دیدہ دلیری سے سرکار کی سرپرستی میں 'ایمان اور عقیدے' پر بھی 'ہندتو' یلغار کر رہا ہے۔ 'ہندوستان کے آئین' کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں اور عدلیہ کے فیصلے سے چشم پوشی کرنا طرۂ امتیاز بنتا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی عام ہندو اکثریت محض تماشائی کی حیثیت رکھتی ہے اور مٹھی بھر سنگھی غنڈے تاک تاک کر حملے کر رہے ہیں۔ اقلیتوں کی زندگی خوف کے سایہ میں بسر ہو رہی ہے۔ مسلم بیزاری اور نفرت انگیزی کی انتہا یہ ہے کہ آسام کی ہیمنت بسوا سرکار نے سابق صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد کے نام سے منسوب فخرالدین علی احمد میڈیکل کالج کا نام تبدیل کر کے اسے 'بار پیٹا میڈیکل کالج' کر دیا ہے۔

گزشتہ دنوں (سنیچر، 7 فروری 2026 کو) ممبئی میں آر ایس ایس کے صد سالہ جشن سے خطاب کرتے ہوئے موہن بھاگوت نے 'ہندو' اور 'ہندتو' کی تشریح کرتے ہوئے بڑی عجیب بات کہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''بھارت میں رہنے والا ہر کوئی ہندو ہے'' انہوں نے مزید کہا کہ ''کسی شخص کا مذہب، بود و باش، اس کی عادتیں اور بھاشا الگ الگ ہو سکتی ہیں، لیکن ہم سبھی سماج، سنسکرتی اور راشٹر کے روپ میں ایک ہیں۔ ہم اسے 'ہندتو' کہتے ہیں۔'' موہن بھاگوت نے مزید کہا کہ ''ہندتو آپ کی حفاظت کی گارنٹی ہے۔''

موہن بھاگوت نے 'ہندو' اور 'ہندتو' سے بھارت کے تمام لوگوں کو (بشمول مسلمان) منسلک کر کے باضابطہ ایک ایسا سیاسی بیانیہ تیار کیا ہے، جو دھمکی آمیز ہے اور ہندوستان کے آئین کے منافی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک صدی قبل کہا تھا:

''ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا''

ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے مادر وطن سے پیار ہے۔ وہ اپنی تہذیب اور ثقافت سے دست بردار نہیں ہو سکتے ہیں۔ سنگھ پریوار کے لوگ 'دلّی' کو 'اندر پرستھا' کہتے رہیں لیکن 'مسلم' خود کو 'ہندو' کبھی نہیں کہہ سکتے۔ البتہ علامہ اقبال کے اس پیغام کا پاس رکھتے ہوئے ہندوستانی مسلمان کہتے رہیں گے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

17 مارچ 2026 —— محمد عارف اقبال

عرض ناشر

مایوسی میں ہلاکت ہے اور امید میں شِفا

محترم قارئین!

'اردو بک ریویو' کی مسلسل اشاعت کا32 واں سال الحمدللہ شروع ہو گیا ہے۔ گزشتہ 31 برسوں کے تلخ وشیریں تجربات سے اپنے قارئین کے ذہن کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا ہی سمجھ لیجے کہ ...اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

گزشتہ برس (2025) اکتوبر میں بھارتی محکمہ ڈاک کے سرمایہ دارانہ فیصلے سے RNI کے تحت شائع ہونے والے رسائل ومجلات کی ترسیل پر غیر معمولی اثر پڑا ہے۔ بھارتی محکمہ ڈاک نے پہلا کارنامہ تو یہ انجام دیا ہے کہ اس نے DL نمبر کے نظام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یعنی اب کسی بھی روزنامہ، ہفت روزہ یا ماہنامہ کی ترسیل پر امدادی سہولت (Subsidy) نہیں مل سکتی۔ اسی طرح رجسٹرڈ پوسٹ کی جگہ اسپیڈ پوسٹ کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے کمزور مالی حیثیت کے رسائل وجرائد کی اشاعت بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ البتہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل پرنٹ میڈیا کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے 1774 میں جس بھارتی ڈاک کو وارن ہسٹنگس نے عوام کے لیے آسان بنانے کی کوشش کی تھی، 2025 کے آزاد ہندوستان میں بھارتی ڈاک کو عوام کے لیے مشکل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان میں بینکوں کے علاوہ درجنوں قسم کے مالیاتی ادارے کے رہتے ہوئے، پوسٹ آفس سے مالیاتی لین دین کا اضافی کام لیا جا رہا ہے۔ حالانکہ پوسٹ آفس پر منی آرڈر کے علاوہ بینکنگ لین دین کی اضافی ذمہ داری کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال سرکار عوام کی خواہش کے برعکس کچھ بھی کر سکتی ہے۔

'اردو بک ریویو' جس کے ایک شمارے کی قیمت 40 روپے تھی، بادل ناخواستہ اس میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یاد رکھیے اس اضافہ سے 'اردو بک ریویو' کا کوئی بھلا نہ ہوگا، البتہ اس کے خسارے میں شاید کچھ کمی آسکتی ہے۔ توقع ہے کہ اردو زبان کی محبت میں ہمارے قارئین اسے گوارہ کریں گے۔ ویسے بھی 'اردو بک ریویو' کے 96 صفحات کو اگر کتابی صورت دی جائے تو ایک شمارہ تقریباً 250 صفحات پر مشتمل ایک 'دستاویزی کتاب' ہوگی جس کی قیمت آج 300 روپے سے کم نہ ہوگی بلکہ زیادہ ہی ہوسکتی ہے۔

مکروفریب کی اس حادثاتی دنیا کی بدلتی ہوئی بدشکل اور خطرناک تصویریں دیکھ دیکھ کر 2026 کا استقبال کیونکر کیا جائے۔ تاہم امید کے ساتھ جینا ہی ہم سب کے لیے امید افزا ہے۔ مایوسی میں ہلاکت ہے اور امید میں شِفا۔ موجودہ عالمی تناظر میں عزم اور استقلال کے ساتھ 'تعمیر' کی طرف بڑھتے رہنے ہی سے عافیت ہے اور شاید 'تخریب' میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔ شِفا اور نصرت تو صرف اللہ رب العزت کی طرف سے ہے۔

—— محمد عارف اقبال
Mobile: 09953630788

28 فروری 2026

THE GLORIOUS QURAN دی گلوریس قرآن

مستند ابتدائی مآخذ پر مبنی تشریحات کے ساتھ نیا انگریزی ترجمہ قرآن

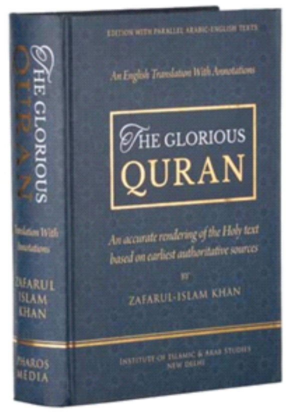

اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید کا درست ترین اور سلیس انگریزی ترجمہ، جس میں قرآن مجید کی تاریخ اور مسائل سمیت متعلقہ موضوعات پر وسیع تشریحات اور ضمیمے، سیرت محمدی ﷺ، اسماء اللہ الحسنیٰ، قرآن میں مذکور انبیاء علیہم السلام کا مختصر تعارف، اسلامی اصطلاحات پر مبنی لغت اور قرآن کا موضوعاتی اشاریہ شامل ہیں۔ یہ سب انتہائی مستند ابتدائی عربی مآخذ پر مبنی ہے۔ قرآن اور اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل اور مستند دستاویز۔ 11 سال کی محنت کا نتیجہ۔

ترجمہ، تشریحی حواشی اور ضمائم: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

مترجم نے ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور مانچسٹر یونیورسٹی (انگلینڈ) سے 1987ء میں اسلامیات میں پی ایچ-ڈی کی۔ وہ عربی، انگریزی اور اردو میں 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔

انگریزی ترجمہ قرآن بشمول عربی متن، 1216 صفحات (مجلد/ ڈبل کلر)۔
ہندوستان: 1195 /روپے / بیرون ممالک: 48 USD (ڈاک/کوریر فری)
صرف انگریزی ایڈیشن، 816 صفحات (مجلد/ بلیک اینڈ وھائٹ)۔
ہندوستان: 795 /روپے / بیرون ممالک: 38 USD (ڈاک/کوریر فری)

PHAROS MEDIA & PUBLISHING PVT LTD
New Delhi
Email: books@pharosmedia.com
Mobile/WhatsApp: +91-98686-56614, +91-98181-20669;
or visit: www.pharosmedia.com

Advtt. 01/2026

قارئین کے تاثرات

❑ ... جناب عارف صاحب قبلہ، السلام وعلیکم

اردو بک ریویو کا تازہ شمارہ (اکتوبر تا دسمبر 2025) موصول ہوا۔ بے حد شکریہ۔

میں ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی یہی کہوں گا اور تواتر کے ساتھ کہتا رہوں گا کہ 'اردو بک ریویو' انڈیا کے چند موقر ترین اردو جریدوں میں سے ایک ہے اور راقم کے لیے پہلے اس کی بذریعہ ڈاک وصولی کسی نعمت سے کم نہ تھی، اور اب سیاسی مسائل کے سبب عائد شدہ قدغنوں کے بعد سافٹ فائل کا ملنا بھی اسی قدر دلنشیں ہے۔

حسب دستور اک عالَم بے چینی میں، فہرست کتب سب سے پہلے دیکھی جاتی ہے، مگر اس بار نظر 'مضامین دوارکا داس شعلہ' پر کیے گئے تبصرے پر ٹھہری۔ سعید اختر اعظمی صاحب نے تبصرے و تعارف کا گویا حق ادا کیا۔ کون ہوگا جو اسے پڑھ کر اصل کتاب تک رسائی کے لیے بے چین نہ ہوگا۔ یہ تبصرہ نگار کے قلم کا اعجاز ہے۔ میری جانب سے سعید صاحب کے لیے ستائش کے یہ سادہ اور معمولی سے الفاظ یقیناً کم ہیں۔ ان کا شکریہ 'اردو بک ریویو' کے ایک پاکستانی قاری کی جانب سے ادا کرتا ہوں۔

بات یہاں تک نہ ٹھہری۔ آپ نے 'اردو بک ریویو' کا انداز کچھ ایسا منفرد رکھا ہے کہ تبصرہ نگار اور اخیر میں فہرست کتب کے مصنّفین و مرتبین کے رابطہ نمبر بھی درج کر دیتے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس حسن ترتیب کا ہم ایسوں کو کس قدر فائدہ ہوتا ہے۔ پروفیسر سید حسن عباس صاحب سے رابطہ اور گفتگو ایک خوشگوار تجربہ رہا۔ اور اردو ادب پر چھائے قحط و یاس کے اس دور میں ایک اچھوتی کتاب کے مرتب سے سیر حاصل گفتگو کے دوران آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔

قصہ مختصر، مضامین شعلہ، ان شاء اللہ تعالیٰ، زندہ کتابیں کے تحت کراچی سے ماہ جنوری (2026) میں شائع ہوگی اور یہاں کے قارئین کو ایک عمدہ کتاب پڑھنے کو میسر آئے گی۔ 'حج کا ثواب' آپ اور پروفیسر عباس کی نذر۔

دوارکا داس شعلہ کا حفیظ جالندھری پر لکھا معرکتہ الآرا خاکہ میں نے 'اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے' کی ایک جلد میں شامل کیا تھا۔ وہ بھی اس واسطے کہ مذکورہ تحریر پاکستان کے ایک پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں شعلہ کی تحریریں پڑھنے کا خواہش مند ہمیشہ رہا۔ یہ خواہش اس انداز سے پوری ہوگی، یہ گمان نہ تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے، زیر نظر سطور یک جہتی موضوع ہی کا احاطہ کرتی ہیں۔ مگر کیا کیجیے صاحب، آپ نے نہال جو کر دیا۔

راشد اشرف (کراچی)
Mobile: +92 333 2312235

❑ ... 'اردو بک ریویو' کا تازہ شمارہ (اکتوبر تا دسمبر 2025) موصول ہوا، جزاک اللہ۔

اس مجلّہ کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے آپ کی سعی و کوشش یقیناً لائق تحسین ہے۔ اس مؤقر مجلہ کے ذریعہ اردو زبان کی مخلصانہ خدمت اور تنقیدی و تعمیری ادب پیش کرنے کے سلسلے میں آپ کی جدو جہد میرے نزدیک قابل رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند و توانا اور ہر قسم کے فتنہ و شر سے محفوظ رکھے اور ادارہ کو مالی استحکام عطا فرمائے۔

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ یہ کام کسی مالی منفعت سے وابستہ نہیں ہے۔ ایک اردو رسالہ کو مسلسل جاری رکھنا بالیقین خسارے کا عمل ہے۔ 9 سال تک بنارس سے ماہنامہ 'تعلیمات جدید' کی ادارت و اشاعت کے بعد خسارہ سہتے سہتے مجھے رسالہ بند کرنا پڑا۔ خدا کرے 'اردو بک ریویو' مشکل حالات سے باہر نکل آئے اور اس کا بہترین اقتصادی انتظام ہو جائے۔ میں بھی اس کے لیے کوشاں ہوں۔

ریاض احمد قادری
J-31/78، کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316

❑ ... 'اردو دنیا کی بے حسی یا تجاہل عارفانہ' یہ مضمون میں نے بارہا پڑھا۔ جس درد، کرب اور سوزِ دل کے ساتھ آپ نے اسے تحریر فرمایا ہے، وہ ہر حساس قاری کے دل میں بے چینی پیدا کر دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں صبر، استقامت اور استقلال کو بالخصوص ایسے ہی نازک اور کٹھن مواقع کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ خواہ ترقی پسند تحریکیں ہوں یا اسلامی شخصیات، سب کو کسی نہ کسی مرحلے پر اسی نوع کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ایسے میں صبر و استقلال کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور بشاشت و حوصلے کے ساتھ اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہنا ہی کامیابی کی راہ ہے۔ یقیناً ہر کام اللہ ہی کی مدد اور نصرت سے پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ آزمائشیں ہمیں توڑنے نہیں آتیں بلکہ نکھارتی ہیں، پرکھتی ہیں اور بالآخر ایک بلند تر مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔

میں نے شاہ حسین نہری صاحب کی خدمت میں آپ کی خیریت اور سلام پہنچا دیا ہے۔ وہ سنتے تو ہیں مگر ان کے الفاظ کو سمجھنا اب خاصا دشوار ہو گیا ہے۔ کل طویل عرصے بعد ان کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے مجھ سے بہت کچھ کہا، مگر افسوس کہ میں ان کی گفتگو کو پوری طرح سمجھ نہ سکا۔

لہٰذا ان ناگفتہ بہ حالات میں ہمارے لیے سب سے بڑا سہارا اللہ کی مدد اور اس کی نصرت پر کامل یقین ہے۔ توکل علی اللہ ہی ہماری اصل طاقت اور امید کا سرچشمہ ہے۔

ڈاکٹر محمد صفی انوری

بیڑ۔(مہاراشٹر) موبائل:9422931765

❑ ... ابھی ابھی 'اردو بک ریویو' کا اداریہ پڑھ کر فارغ ہوا۔ اس علمی، تحقیقی و تاریخی اداریہ کے مطالعے نے ذہن کے دریچے کھول دیے۔ آپ نے اس مختصر تحریر میں اپنے وطن عزیز میں رائج نسلی امتیاز پر مبنی فرقہ واریت کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے، جو اصحاب فکر کے لیے اس ملک کی موجودہ سیاسی و سماجی پس منظر پیش کرتی ہے، جو ملک کی ستم زدہ اقلیتوں کی مستقبل سازی کے عمل میں معاون ہے۔

اللہ تعالیٰ ملک و ملت کی فلاح کے لیے آپ کی فکری کاوشوں کو قبولیت عطا کرے اور دین و دنیا میں نیک اجر سے سرفراز کرے۔ آمین!

محمد معین الدین حبیبی

جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

Mobile: 9910102398

فرمانِ الٰہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خسارے میں رہنے والے لوگ

ترجمہ:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں ○ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی مَوت کا وقت آجائے اور اُس وقت وہ کہے کہ 'اے میرے رب! کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا' ○ حالاں کہ جب کسی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے ○

[المنٰفقون: آیات ۹ تا۱۱]

ترجمانی: علّامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

منجانب ——— ایک خیر خواہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: چمن کا دیدہ ور

(پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تازہ کتاب کا 'پیش گفتار')

مولانا علی میاںؒ کی شخصیت پر کتابیں بہت لکھی گئی ہیں، عربی میں بھی، اردو میں بھی اور چند کتابیں انگریزی میں بھی، لیکن ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے اور ان کی شخصیت ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ مولانا علی میاںؒ نے پیامِ انسانیت کی تحریک شروع کی تھی، اس تحریک کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھا گیا۔ مولانا علی میاںؒ نے امت کی عظیم شخصیات اور مجددین کے کارناموں کی تاریخ کئی جلدوں میں مرتب کی اور اسی کے ساتھ النبوّۃ والأنبیاء فی ضوء القرآن اور اس موضوع پر کتابیں عربی اور اردو میں تصنیف کیں۔ انبیائے کرام اور امت کے مصلحین کے کاموں کے درمیان جو بنیادی فرق ہے، اس کو ضرور سمجھا تھا۔ انبیائے کرام نے قوم کو "لا تعبدوا الا ایاہ" کا پیغام دیا تھا، ہمارے مصلحین کا پیغام اس سے مختلف تھا اور انہوں نے اصلاح کا علم بند کیا تھا۔ کفار ومشرکین ان کے مخاطب ہی نہیں بن سکے تھے الا ما شاء اللہ۔

مولانا علی میاںؒ پیغمبرانہ مشن کو زندہ کرنا چاہتے تھے، لیکن جو کام پیغمبروں نے کیا تھا وہ آسان نہ تھا۔ ہر پیغمبر لسانِ قوم میں بات کرتا تھا اور قوم کے اصاغر واکابر سے اس کے تعلقات بھی ہوتے تھے اور رشتہ داریاں بھی ہوتی تھیں، اس لیے وہ دعوت کا کام شروع کر دیتا تھا اور اس کے لیے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی تھی، لیکن ہندوستان میں دعوت کا پورا پلیٹ فارم ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، مدعو قوم سے تعلقات بھی زیادہ نہ تھے بلکہ کشیدہ تھے، اس لیے مولانا علی میاںؒ نے ''پیامِ انسانیت'' کے نام سے تحریک شروع کی کہ پہلے دعوت کا وہ پلیٹ فارم تیار ہو سکے جس کے ذریعہ دعوت کا کام ممکن ہو سکے۔ بہت کم لوگوں نے مولانا کی تحریک 'پیغامِ انسانیت' کی حقیقت کو سمجھا۔

مولانا کی شخصیت کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہ ہے جسے اقبال کی زبان میں ''اس کے دنوں کی تپش اس کے شبوں کا گداز'' کہا جا سکتا ہے۔ رات کے پرسکون لمحات میں مولانا کا امت کے حالات کی وجہ سے یا ملک کے اندر خوں ریز فسادات کی وجہ سے بے سکون ہو جانا اور بے خواب رہنا اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنا، یہ وہ پہلو ہیں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہیں۔ حدیث کے الفاظ "المسلم کجسد واحد" یعنی مسلمان ایک جسد واحد کی طرح ہے، اس کی تفسیر مولانا کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ کچھ لوگ جو مولانا کے بہت قریب تھے وہ مولانا کی اس حالت سے واقف تھے، لیکن ان کے پاس قلم نہیں تھا کہ مولانا کی ان کیفیات کی تصویر کشی کرتے۔ راقم سطور کے نزدیک مولانا کی شخصیت کا یہ پہلو اتنا اہم ہے کہ اس نے ایک سمینار میں اپنے ایک عربی مقالہ میں جو اس مجموعہ میں شامل ہے، اس خصوصیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"وله حس مرهف لأوضاع المسلمين في الهند فاذا رأى نكبة تنزل على المسلمين فكان يتململ تململ السليم وكان الحدث يُقض مضجعه"

مولانا کی شخصیت کا بہت اہم پہلو وہ ہے جسے اخلاقِ نبوی کا پرتو کہا جا سکتا ہے۔ مولانا کی زبان سے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں ہوئی اور زبان اتنی محتاط کہ زبان وادب کی تاریخ میں جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اقبال کا مصرعہ ''ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم'' کی مجسم تصویر۔ مثال کے طور پر مولانا نے سیرت

''المرتضیٰ'' لکھی۔ کتاب کے ہیرو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں لیکن کیا مجال کہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد بھی امیر معاویہؓ کی طرف سے کسی کے دل میں کوئی میل پیدا ہو جائے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کو یہ سلیقہ نصیب ہوتا ہے، مولانا کی شرافتِ قلم کی اتنی مثالیں ہیں کہ لوگ ان کو بہت کم جانتے ہیں، لیکن زبان کی احتیاط سیکھنے کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ مولانا نے اپنے والد کی سوانح 'حیات عبدالحیؒ' کے نام سے لکھی۔ اہل علم واقف ہیں کہ مولانا عبدالحیؒ اور علامہ شبلی کے درمیان اختلافات تھے۔ مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب میں ان اختلافات کے بارے میں پورا ایک باب لکھ ڈالا ہے لیکن ہر پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ مولانا کا قلم گویا پل صراط پر سے گزر رہا ہے اور کسی ایک طرف بھی جھکا ہوا نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا نے بہت سی شخصیات پر تنقید بھی کی ہے لیکن اس اعتدال کے ساتھ اور اس خوبصورت لہجے میں کہ کسی ایک کو بھی یہ تنقید ناگوار نہیں ہوتی، بلکہ بعض مرتبہ تو لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ مولانا تنقید فرما رہے ہیں۔

ایک مثال یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب (امیر جماعت تبلیغ) کا انتقال ہوا تو 'الفرقان' نے خاص نمبر شائع کیا، اس نمبر میں مولانا علی میاںؒ کا مضمون ''خوش درخشید ولے دولتے مستعجل بود'' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں مولانا یوسف صاحب اور جماعت تبلیغ کی فکر سے اختلاف کیا تھا، لیکن اپنی آرام پسندی اور رخصت پسندی کا ذکر کر کے اس فکری اختلاف کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔

اسی طرح سے 'مدرسۃ الاصلاح' سرائے میر میں مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک بہت بڑا سمینار منعقد ہوا۔ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے جس اندازِ خاص سے اپنے خطبۂ صدارت میں مولانا فراہیؒ کی فکر سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا تھا اس کے سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔

مولانا علی میاںؒ نے مولانا مودودیؒ کی فکر پر بھی تنقید کی ہے اور ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا ہے، لیکن جس نرم و نازک اور شیریں لہجے میں اس اختلاف کا اظہار ہوا ہے، اس کی داد علامہ یوسف القرضاویؒ نے اپنے ایک مضمون میں دی ہے، جو اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ نرم و نازک اختلاف اور شیرینئ گفتار کی مثال آسانی کے ساتھ نہیں ملے گی۔ آدابِ اختلاف پر کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اختلاف کے اس اونچے مقام تک آج تک کوئی پہنچا ہی نہیں۔ 'سوئے دار' کو 'کوئے یار' بنانے کا ہنر اور 'نار' کو 'نور' بنانے کا فن ہر شخص کو نہیں آتا، صرف شاعر کا دل ہے جو ان نازک احساسات کی ترجمانی کر سکتا ہے:

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

تنقید کی یہ نرمی و شیرینی اور یہ لطافت اور یہ حلاوت جسے سن کر کوئی بے مزہ نہ ہو، مولانا کا امتیاز خاص ہے، جس میں کوئی بھی شخص ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ جو لوگ تنقید کا مطلب سنگباری اور اس سے آگے بڑھ کر سنگساری سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں یہ تنقید ہی نہیں:

کتنے شیریں ہیں ترے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کے جلوے بے شمار ہیں، مولانا کی زندگی میں استغنا اور دولت دنیا سے بے نیازی کے جو واقعات ملے ہیں وہ پورے ایک مضمون کے متقاضی ہیں۔ علامہ یوسف القرضاویؒ نے اپنی کتاب میں ان واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کا مضمون اس کتاب کے آخر میں پڑھا جا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ مشکل ہے کہ مولانا کو علماء کے کس زمرے میں رکھا جائے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے علماء گزرے ہیں جو بہت بڑے مصنف تھے، ایسے علماء بھی گزرے ہیں جن کی زندگی حکومت کے ساتھ کشمکش کی داستان ہے اور ایسے علماء بھی موجود ہیں کہ دین اسلام اصلاً ان کے نزدیک غلبے اور حکمرانی کا دین ہے اور خدائی قانون کا نفاذ سب سے مقدم ہے، اسی کے ساتھ ایسے علماء کی بھی کمی نہیں جن کے نزدیک اصل چیز تزکیۂ نفس، تطہیر باطن اور ذکر وابتہال ہے، باقی چیزیں فروعی ہیں۔ تاریخ اسلام میں سب فکر کے نمائندے موجود ہیں۔ مولانا علی میاںؒ نے ہر قسم کے علماء کی فکر کا عطر کشید کر کے خود کو عطر مجموعہ بنا ڈالا۔ جن لوگوں نے مولانا علی میاںؒ کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ گواہی

دیں گے کہ ان کی شخصیت میں یزید بسطامیؒ بھی ہیں، امام غزالیؒ بھی ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی۔

عام حالات میں مولانا علی میاںؒ خوں ریزی اور تشدد کے ذریعہ مسلم ملکوں میں انقلاب لانے کے بجائے حکام وقت تک دین کو پہنچانے کے قائل ہیں اور مجدد الف ثانی کے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے بعد آزادی اور جمہوریت کی فضا میں مولانا نے جو کیا اس سے زیادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے تمام دینی کاموں کی سرپرستی کی اور خدمت دین کا ہر ممکن کام انجام دیا اور عرب و اسلامی ملکوں تک اپنی آواز پہنچائی۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔

مولانا علی میاںؒ صاحبِ دل اور صاحب ذکر ہونے کے باوجود ان مفکرین میں نہیں ہیں جو صرف تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن پر زور دیتے ہیں اور روحانیت کے رہبر ہیں، جیسے شیخ ابو یزید بسطامیؒ اور حضرت خواجہ معروف کرخیؒ۔ مولانا علی میاںؒ ان علماء کی صف میں ہیں جن کے نزدیک نظامِ خلافت کے احیاء کی کوشش بھی مطلوب ہے اور جن کے نزدیک اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ان کی کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' اور ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' اور ''اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' سے ان کی شخصیت کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مولانا کی شخصیت میں مختلف زاویۂ نظر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت اسی امتزاج اور نقطۂ اعتدال کی ترجمانی کرتی ہے۔ مولانا کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں جن پر لکھا نہیں گیا، بلکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

راقم سطور نے مختلف جلسوں اور سمیناروں میں جو مقالے پڑھے تھے، ان کو اس مجموعہ میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لیے قاری کو کہیں کہیں ''قندمکرر'' سے سابقہ پیش آسکتا ہے جسے گراں نہیں گزرنا چاہیے۔ مولانا کی شخصیت پر راقم سطور نے عربی میں جو مقالات لکھے تھے وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں، پھر بھی مولانا کی تمام خوبیوں کا شمار مشکل ہے۔ بابا فغانی شیرازی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

خوبی ہمی کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست

نام کتاب:
مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ: ایک ناقابل فراموش شخصیت
(اردو، عربی)
مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی
ISBN: 978-93-5636-956-6
صفحات: 144، اشاعت: 2026، قیمت: 140 روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ نشانِ راہ، نئی دہلی-110025
Mobile: 9899545546

□□□

Statement of Ownership & Other Details

URDU BOOK REVIEW, Quarterly

(As per Form IV) R.N.I. No. 63106/95

***Place of Publication* :**
1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Daryaganj, New Delhi-110002

Periodicity : Quarterly
Printer : Mohammad Arif Iqbal
Nationality : Indian
Address : E-75, Street No. 3, Madanpur Khadar, Kanchan Kunj, Sarita Vihar, New Delhi-110076
Publisher : Mohammad Arif Iqbal
Nationality : Indian
Address : E-75, Street No. 3, Madanpur Khadar, Kanchan Kunj, Sarita Vihar, New Delhi-110076
Editor : Mohammad Arif Iqbal
Nationality : Indian
Address : E-75, Street No. 3, Madanpur Khadar, Kanchan Kunj, Sarita Vihar, New Delhi-110076
Owner : Mohammad Arif Iqbal
Nationality : Indian
Address : E-75, Street No. 3, Madanpur Khadar, Kanchan Kunj, Sarita Vihar, New Delhi-110076

I, Mohammad Arif Iqbal, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Sd. (Mohammad Arif Iqbal)
Publisher

نئی کتاب

تحریک اسلامی کی پُرعزم خواتین

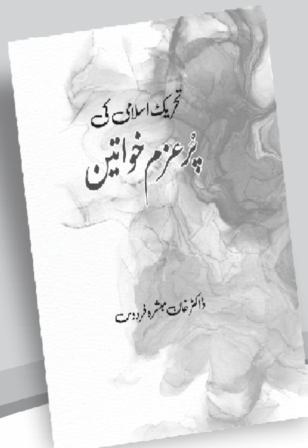

ڈاکٹر خان مبشرہ فردوس

یہ کتاب تحریک اسلامی کی درخشاں تاریخ اور تحریکی خواتین کا سبق آموز مرقع ہے۔ اس میں ان پرعزم خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے مردوں کے شانہ بشانہ دعوت وعزیمت کی حوصلہ بخش داستانیں رقم کی ہیں۔ اس میں علم وحکمت اور فہم وفراست کی روشنی بھی ہے اور اخلاق وکردار کی خوشبو بھی۔ جہد وعمل اور استقامت ومقابلے کی حرارت بھی اور مہر ومحبت اور جذب وعشق کی لطافتوں کا سرور بھی۔ عظیم خواتین کی سادہ زندگیوں کا تعارف بھی اور گم نام عورتوں کے کردار کی عظمتیں بھی۔

یہ کتاب لڑکیوں اور خواتین کے لیے خاص طور پر مہمیز کا کام کرے گی۔

* سائز: 23X36/16 * صفحات: 312 * قیمت: 230.00

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

mmipublishers@gmail.com www.mmipublishers.net 7290092403

Sub Depot: Hyderabad : 9491874087 | Mumbai : 9699167700 | Goa : 9987196549 | Bangalore : 9036996740

میاں مَرد بنو مَرد!

از: احمد حاطب صدیقی (ابونثر)

حبیبِ لبیب جناب اسلم الوری سے ایک دن کسی نے پوچھ لیا:

''مردم شماری کو مردم شماری کیوں کہا جاتا ہے؟ اس عمل میں تو خواتین بھی شمار کی جاتی ہیں''۔

الوری صاحب نے سوال سنتے ہی معاملہ ہماری طرف منتقل کر دیا۔ کہنے لگے کہ

''بھائی!... تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟''

پوچھنے والے کو اُلجھن شاید اس وجہ سے ہوئی کہ 'مرد' اور 'مرُدم' دونوں الفاظ کو حضرت ہم معنی سمجھے بیٹھے تھے۔

نہیں صاحب! ایسا نہیں ہے۔ دونوں الفاظ ہرگز ہرگز ہم معنی نہیں۔ دونوں کے الگ الگ معانی ہیں۔

'مَردُم' اسم جنس ہے۔ اس کا مطلب ہے 'انسان' یا 'آدم زاد' یعنی آدم کی اولاد۔ 'مردُم' کے معنوں میں مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے، جوان اور نوجوان سب شامل ہیں۔ جہاں بھی لفظ 'مردُم' استعمال ہوتا ہے اس سے مراد عام لوگ یا تمام لوگ لیے جاتے ہیں۔ مثلاً جو شخص لوگوں سے دُور بھاگتا ہو وہ 'مردُم بیزار' کہلاتا ہے۔ جو آدمی دوسرے آدمیوں کو بے سبب یا عادتاً تنگ کرتا اور ستاتا ہو اُسے 'مردُم آزار' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریز سے ورثے میں ملی ہوئی نوکر شاہی میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کی سمجھ میں 'مردُم آزار' کے معنی نہ آتے ہوں تو کسی خرانٹ 'نوکر شاہ' سے جا کر مل لیجے، مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا۔

جس خطے یا جس شہر میں عالم و فاضل اور لائق و فائق لوگ زیادہ پیدا ہوئے ہوں، اُسے 'مردُم خیز' خطہ یا 'مردُم خیز' شہر کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ ہر خطہ اور ہر شہر مردُم پیدا کرنے میں خاصا خود کفیل ہوتا ہے۔ 'مردُم خیز' کے لفظی معنی ہیں ''جہاں انسان بکثرت پیدا ہوں''۔

لیجے، مردُم کے ذکر پر ہمیں شیخ نذیر کے دو اشعار یاد آگئے۔ پہلا شعر غالباً بڑھاپے میں کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اِس منزلِ ہستی پہ ٹھہرنا ہے مناسب
آگے تو خدا جانے سڑک ہے کہ نہیں ہے
سب مردُم مردان ہیں پنڈی میں فروکش
رستے میں وہ دریائے اٹک ہے کہ نہیں ہے؟

جو لوگ اچھے بُرے انسانوں کی پرکھ رکھتے ہیں وہ 'مردُم شناس' کہے جاتے ہیں۔ 'مردُم شناسی' کمیاب صفت ہے۔ جو اہل کار ملک بھر کے اچھے بُرے سب لوگوں کو گن کر آبادی کے اعداد و شمار میں گڑبڑ کر دیتے ہیں وہی 'مردُم شمار' سمجھے جاتے ہیں۔ مردُم شماری ایک ضرورتِ سرکاری ہے۔ شریر انسانوں کے ڈنک سے ڈسے ہوئے لوگ خود کو 'مردُم گزیدہ' کہتے ہیں جیسا کہ چچا اسداللہ خان غالبؔ نے کہا:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردُم گزیدہ ہوں

'مردُم' جمع مذکر ہے۔ تاہم اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔ شعورؔ پوچھتے پھرتے تھے:

کیوں آسماں پہ مردُمِ خاکی کا ہے دماغ
یہ لوگ رہنے والے گڑھی کے سرا کے ہیں

جب کہ سوداؔ نے اپنے جی میں ٹھان لی تھی کہ گھر میں بے کار پڑے پڑے اینڈنے والے تمام نکھٹو شہریوں کو کام پر لگا کر رہیں گے:

یہ جی میں آئی ہے یوں روئیے کہ مردُمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

ویسے مردُم آنکھ کی پُتلی کو بھی کہتے ہیں۔ پُتلی اگر چھوٹی ہو تو 'مردُمک' کہلاتی ہے۔ چچا غالبؔ ہی نے ''چکنی ڈلی'' (یعنی ثابت چھالیہ) کا قصیدہ لکھتے ہوئے اسے مردمک سے تشبیہ دینے کی (ناکام) کوشش کی تھی:

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے
کیوں اِسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کہنا یہ تھا کہ 'مردُم شماری' کا مطلب فقط 'مرد' شماری نہیں۔ اگر آپ ملک بھر میں صرف مرد شمار کرنے نکلیں گے تو بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس ملک میں مرد ہیں ہی کتنے؟ ہمیں تو اپنے حکمرانوں اور اپنے حکام میں بھی ایسا کوئی مرد یا مَردوں کا مرد نظر نہیں آتا جو مردانہ وار فیصلہ کر سکے کہ اب سے اس قوم کا ہر کام صرف قومی زبان میں ہوگا۔ ہم غلامی کے شکنجوں سے اپنے گلے کو، اپنے حلق کو، اپنے ذہن کو اور اپنی زبان کو آزاد کرا کے پرائی زبان کی جگہ قومی زبان کو سربلند کریں گے۔ یوں قوم کا سر بھی ہم فخر سے بلند کر دیں گے۔ ہے کوئی ایسا مرد؟

ہماری قومی زبان میں 'مرد' کا لفظ صرف خاوند، شوہر یا جنسِ ذکور کے کسی فرد ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں سُورما، بہادر، شجاع اور دلیر شخص کے لیے بھی 'مرد' ہی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ فارسی کی بڑی مشہور کہاوت ہے جو اُردو میں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہے:

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

''کوئی مشکل ایسی نہیں جو بالآخر آسان نہ ہو جائے۔ مرد وہ ہوتا ہے جو مشکل حالات سے ڈر نہیں جاتا''۔ دلیری اور جرأت کو دوسرے الفاظ میں 'مردانگی' کہا جاتا ہے۔ 'جواں مردی' بھی بہادری ہی کو کہتے ہیں۔ لوہے کی طرح مضبوط اعصاب کے مالک اور جرأت کے ساتھ فیصلے کرنے والا رہبر اپنی قوم کا 'مردِ آہن' قرار پاتا ہے۔ اپنے شعبے میں کامیاب اور فاتح شخص کو 'مردِ میدان' کہا جاتا ہے۔ بحرانوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو جانے والا شخص 'مردِ بحران' ہوتا ہے۔

آدمی اگر شریف ہو تو اُسے بھی 'مردِ آدمی' قرار دیا جاتا ہے۔ دیکھیے، سحرؔ اپنی شرافت و نیک نامی کا دعویٰ اس طرح کرتے ہیں کہ

افشائے رازِ عشق کریں ان میں ہم نہیں
اِک مردِ آدمی کو نہ بدنام کیجیے

حوصلہ مند شخص کو بھی 'مرد' ہی قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ ''حبِ وطن'' کے موضوع پر اپنی طویل نظم میں اہلِ وطن کے حوصلے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

کسی کو حوصلہ دلانے کے لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ''مرد بنو مرد''۔ مگر مرد بننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ حفیظ آزرؔ کہتے ہیں:

آزرؔ کچھ ہم پر ہی نہیں الزام شکستہ پائی کا
عشق کے نام پہ ہو جاتے ہیں اچھے اچھے مرد ہوا

ملک و قوم سے عشق کا دعویٰ کرنے والے تو بہت ہیں، مگر جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ استعماری زبان کی غلامی سے قوم کو آزاد کراؤ، تو یہ سنتے ہی ہراساں ہو کر ہوا ہو جاتے ہیں۔ اب آپ اُن سے لاکھ کہتے رہیے کہ ''مرد باید کہ ہراساں نہ شود''۔ یا یہ کہ ''میاں! مرد بنو مرد''۔

[بشکریہ فرائیڈے اسپیشل، کراچی]

❑❑❑

مرادآباد میں
'اردو بک ریویو' حاصل کرنے کا پتہ

Janab Adeeb Alam Qureshi
S/o Mr. Alam Qureshi
Near Girls Inter College
Mohalla Asalatpura
MORADABAD - 244001 (U.P.)
Mobile: 8218345142

پروفیسر محمد نعمان خان (بھوپال)

این سی ای آر ٹی (NCERT) نئی دہلی کے ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز سے سبکدوش پروفیسر محمد نعمان خان کا تدریسی و تحقیقی تجربہ تقریباً 32 برسوں کو محیط ہے۔ ملازمت کے سبب ایک عرصے تک دہلی میں مقیم رہے۔ این سی ای آر ٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن بھوپال منتقل ہوئے۔ اس سے قبل پروفیسر نعمان خان بھوپال کے سیفیہ پی جی کالج میں یکم جولائی 1981 سے 3 اپریل 2002 تک شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ 1996 سے 2002 تک اس شعبہ اردو کے وہ ہیڈ بھی رہے۔ پروفیسر نعمان خان کی نگرانی میں آٹھ اسکالرس کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں دی جا چکی ہیں۔ اسی طرح 15 ایم اے کے طلبا نے ان کی نگرانی میں مقالات لکھے۔ تقریباً آٹھ کتابوں کے مصنف پروفیسر نعمان خان نے 6 سے زائد کتابوں کی ایڈیٹنگ کا فریضہ بھی ادا کیا۔ انہوں نے مدھیہ پردیش حکومت (SCERT) کی دو درجن کے قریب درسی کتب کی ادارت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے NCERT کی 45 کے قریب اردو کی درسی کتابوں کی تیاری میں بحیثیت ممبر یا کوآرڈی نیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ موصوف کی پانچ کتابیں نقد و تحقیق، تعلیم و تدریس، سخنورانِ بھوپال، نقد و نظر، کتابوں کی باتیں زیر طبع ہیں۔ پروفیسر نعمان خاں کو ان کی تحقیقی، ادبی اور علمی خدمات کے صلے میں ایوارڈز و اعزازات سے سے بھی نوازا گیا جن میں نواب صدیق حسن خاں ایوارڈ، مدھیہ پردیش اردو اکادمی شامل ہے۔

اہم تصانیف : ● بھوپال میں اردو: انضمام کے بعد ● فلسفۂ تعلیمات ● تلاش و تجزیہ/ اپنوں کے درمیان ● تفہیم و تاثر/ نایاب ہیں ہم ● سرمایۂ ادب ● ملّا رموزی (مونوگراف) ● ابراہیم یوسف (مونوگراف)، مزید چار کتب

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 2 جولائی 1952ء مقام: بھوپال (مدھیہ پردیش)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ پھول محل مڈل اسکول بھوپال، جہانگیریہ ہائر سکنڈری اسکول، بھوپال

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ مادری زبان: اردو۔ ذریعہ تعلیم: ہندی اور انگریزی

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ فکشن، شاعری، غیر افسانوی نثری اصناف، تحقیق و تنقید، تدریسیات

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ فسانہ بنے گا کال (سوانح) عبدالصمد

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ ولی، میر، غالب، اقبال، فیض، حالی، شبلی، قرۃ العین حیدر، ملا رموزی، تخلص بھوپالی، عبدالقوی دسنوی

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ قرآن۔ سیرۃ النبیؐ۔ حیاتِ ابوالکلام آزاد

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ کلیات اقبال۔ مضامین سرسیّد۔ غبار خاطر

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ اردو بک ریویو، آج کل، ایوان اردو، جامعہ، انتساب، اردو دنیا، روزنامہ 'ندیم'، نیا نظریہ (بھوپال)

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ جی ہاں۔ الحمدللہ!

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ جس میں اعلیٰ انسانی، اخلاقی اقدار، حق و انصاف، مساوات، قومی یک جہتی، عدم تشدد، شاندار ماضی اور مستقبل سے متعلق متن و مواد شامل ہو

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ مثبت، تعمیری، اخلاقی، علمی اور اصلاحی زاویے سے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ پورے طور پر مطمئن نہیں ہوں کیونکہ آزادی کے 78 سال بعد بھی صد فی صد خواندگی کا ہدف مکمل نہیں ہو سکا ہے

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ ابتدائی سطح پر مادری زبان اردو کی تدریس لازمی ہے اور اسے روزگار اساس بنانا بھی ضروری ہے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ ماسوائے چند، بیشتر اردو اکادمیاں غیر فعال ہیں۔ NCERT، NCPUL، NIOS، NBT، ساہتیہ اکادمی وغیرہ کی کارکردگی اطمینان بخش ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ قرآن، سیرت اور احادیث کے بعد کلیات اقبال، آبِ گم، بمبئی سے بھوپال تک

● **مکمل پتہ:** گلشن دسنوی، گرین ویلی، ایئر پورٹ روڈ، بھوپال-462030 (مدھیہ پردیش) Mob: 9891424095
E-mail: mnkhanncert@gmail.com

پروفیسر ضیاء الدین ملک فلاحی (علی گڑھ)

پروفیسر ضیاءالدین ملک فلاحی کا آبائی وطن ضلع نوادہ (بہار) کا قصبہ نرہٹ ہے۔ یہ گاؤں ملک نامی برادری کا سرخیل گاؤں کہلاتا ہے۔ ضیاءالدین فلاحی کی ابتدائی تعلیم درس گاہ اسلامی رامپور (1978 تا 1981) میں ہوئی۔ اس درس گاہ میں ان کے والد ماسٹر خلیل الرحمٰن (1925-2012) بچوں کے اتالیق تھے۔ رامپور کے بعد انہوں نے جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ سے عالمیت اور فضیلت (1981 تا 1988) کی اسناد حاصل کیں۔ عصری تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو منتخب کیا جہاں سے انہوں نے بی اے (تاریخ)، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ—ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات انہوں نے پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی کی نگرانی میں مکمل کیے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین ملک فلاحی کا عارضی تقرر شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں بحیثیت لکچر 20 ستمبر 2002 کو ہوا۔ 30 مارچ 2015 کو اس شعبہ میں ان کی ملازمت مستقل ہوگئی۔ پھر اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور تقریباً سات سال کے بعد 15 اپریل 2023 کو پروفیسر کا عہدہ بھی تفویض کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین فلاحی نے اپنے 23 سالہ تدریسی سفر میں قرآنیات کے ساتھ دیگر تحقیقی و علمی موضوعات پر تین درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہوئے۔ تدریسی مصروفیات کے ساتھ موصوف رابطہ عامہ کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ قرآنیات پر 13 وقیع مقالات ہند و پاک کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اسی طرح چار کتابیں خلیق احمد نظامی، مرکز علوم القرآن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

اہم تصانیف: ● برصغیر ہند میں علوم فقہ اسلامی کا ارتقا ● برصغیر میں فقہی مخطوطات و مطبوعات: ایک مطالعہ ● اسلام کا نظام قضا: مطالعات (انگریزی سے اردو ترجمہ) ● حکیم عبدالحمید: حیات و خدمات کے چند گوشے ● قیامت کبریٰ (عربی سے اردو ترجمہ) ● ہندو محققین کا مطالعہ قرآن و سیرت ● عبدالرحیم قدوائی کے قرآنی مطالعات (انگریزی سے اردو ترجمہ)

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 25 اگست 1968ء مقام: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ مرکزی درس گاہ اسلامی رامپور

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ اسلامیات، قرآنیات، فقہیات

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ اسلام کا نظام عدل از سیّد قطبؒ

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ نسیم حجازی، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ مسلم گھرانا ملا کوئی انقلابی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ بدایۃ المجتہد از ابن رشد قرطبی

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ انقلاب، دعوت، زندگی، اردو بک ریویو، تحقیقات اسلامی، علوم القرآن

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو مادری زبان بھی سمجھتے ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ سیکولر کا ایک مفہوم خدا بےزار بلکہ مذہب دشمنی ہے، یہ تصور کسی قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔ سیکولر تعلیم کو جمہور پر تھوپنا بھی نہیں چاہیے

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ یہ رجحان آزاری اور بےحسی کو فروغ دینے والا ہے۔ مقصد زندگی سے عاری ہے اور بےراہ رو ہے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ نہیں۔ تعلیمی پالیسی ایسی ہو جو کسی خاص مذہب/ کلچر کو دوسروں پر مسلط کرنے والی نہ ہو۔ ایسی ترقی اگر ہو بھی تو اسے ترقی کے نام پر ظلم اور ناانصافی کہا جائے گا

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ آج تعلیم کے ہر شعبے کو روزگار سے جوڑنا اس کی ترقی کے لیے لازمی ہے۔ اردو زبان و ادب کو روزگار سے اگر نہیں جوڑا گیا تو زبان مر جائے گی۔ صرف مدارس اسے زندہ نہیں رکھ سکتے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ ترقیاتی منصوبوں کا جو کچھ شعور ہے اس سے اطمینان نہیں ہے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے ساتھ سوتیلا برتاؤ جاری ہے۔ حکومت کی مضبوط سرپرستی اور محبانِ اردو کی محنت و خلوص ضروری ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ تفہیم القرآن از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

● **مکمل پتہ:** شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-202002 (یوپی)، موبائل: 9927206518
Email: ziauddin.malik.falahi@gmail.com

سیّد منصور آغا (نئی دہلی)

اتر پردیش کے میرٹھ (موجودہ ضلع باغپت) سے آبائی تعلق رکھنے والے اردو کے سینئر صحافی سیّد منصور آغا نے اپنی صحافت کا عملاً آغاز ہفت روزہ دعوت، نئی دہلی کے شعبہ ادارت سے کیا تھا۔ 1984 میں روزنامہ 'قومی آواز' میں انہوں نے بحیثیت سب ایڈیٹر کام کرنا شروع کیا اور بہت جلد ان کو نیوز ڈیسک کی ذمہ داری مل گئی۔ 2005 میں اپنی 20 برسوں کی صحافتی خدمات کے بعد وہ باضابطہ روزنامہ قومی آواز سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد ان کے مضامین روزنامہ اردو اخباروں اور ویکلی کالم انگریزی ہفت روزہ ریڈینس (Radiance Views Weekly) میں شائع ہوتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے چند کتابیں بھی مرتب کیں۔ لیکن کووڈ: 19 کے بعد یہ سلسلہ ذرا کمزور ہو گیا۔ دسمبر 2023 میں بینائی خراب ہونے کے سبب صحافت سے عملاً تعلق منقطع ہو گیا۔ سیّد منصور آغا ایک جہاں دیدہ دانشور و صحافی ہیں۔ سیّد منصور آغا نے ایک درجن کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان تراجم میں اسلام میں حلال وحرام (علامہ یوسف القرضاوی) اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب کا ہندی ترجمہ 'اسلام پریچئے' شامل ہیں۔

اہم تصانیف : ● پیکرِ فکر و عمل سیّد حامد ● تین سو سے زائد اردو اخبار کالم ● 250 سے زائد انگریزی کالم مطبوعہ ریڈینس ویوز ویکلی

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ اصل یکم اکتوبر 1943، باعتبار اسناد یکم اکتوبر 1945ء

مقام: موضع جوہڑی، ضلع میرٹھ، موجودہ ضلع باغپت (اتر پردیش)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ اپنے گھر کے قریب مسجد میں مکتب سے

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو۔ ذریعہ تعلیم: ہندی وانگریزی

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ اسلامیات، سیاسیات اور ادب

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ تفہیم القرآن بذریعہ آڈیو ریکارڈنگ

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ شفیع الدین نیر کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، علامہ اقبال، اشرف علی تھانوی، ابن صفی، نسیم حجازی وغیرہ

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ کچھ متعین نہیں، البتہ سب سے زیادہ متاثر قرآن کے تراجم وتفاسیر نے کیا

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ مقدمہ ابن خلدون، افلاطون کی سیاست، مولانا مودودی کی خلافت و ملوکیت، ڈاکٹر حمید اللہ کی مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ... غبار خاطر... وغیرہ

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ ابتدا میں مدینہ بجنور، اس کے بعد بے باک سہارنپور، الجمعیۃ دہلی، دعوت دہلی۔ دوران صحافت ملک سے شائع ہونے والے اردو کے تمام اخبارات زیر نظر آتے رہے ہیں۔ انگریزی کا اخبار Indian Express ایمرجنسی سے لے کر چند سال قبل تک مطالعہ میں رہا

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ جی ہاں! سب کی مادری اور روزمرہ کی زبان الحمدللہ اردو ہی ہے

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ تعلیم سیکولر نہیں ہوا کرتی صرف نظام حکومت سیکولر ہوا کرتا ہے، جس کا اصل اور بنیادی مطلب یہ ہے کہ ریاست مذہب کی بنیاد پر اپنے کسی شہری کے ساتھ کوئی تفریق نہیں کرے گی...

● علم وادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ دور جدید میں علم کی اہمیت پس پشت چلی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ کتب بینی کا ذوق معدوم ہو رہا ہے، لائبریری اور کتب خانے بند ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ چکن مٹن کی دکانیں کھل رہی ہیں، نوجوان نسل پر کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا حاوی ہیں

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ ہرگز نہیں۔ بحیثیت مجموعی انحطاط کا دور نظر آتا ہے...

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ جو زبانیں روزگار کے مواقع فراہم کرتی ہیں ان کو دیگر زبانوں پر یقینی طور پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔ اردو میں روزگار کے مواقع آج بھی موجود ہیں شرط یہ ہے کہ لیاقت ہو۔ اردو کی مقبولیت کا تعلق بول چال سے ہے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ اکادمیوں کی صورتحال مختلف ہے، مغربی بنگال دیگر کے مقابلے بہتر ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ سوائے کتاب اللہ کے کوئی اور متعین کتاب ایسی ذہن میں نہیں ہے

● **مکمل پتہ:** D-82، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی-110025 ـ Mobile: 9818678677
Email: syyedagha8@gmail.com

پروفیسر مظہر احمد (نئی دہلی)

ذاکر حسین دہلی کالج (ایوننگ) کے شعبہ اردو سے وابستہ پروفیسر مظہر احمد کا تدریسی تجربہ تقریباً 32 برسوں کو محیط ہے۔ انہوں نے 1991 میں یونیورسٹی آف دہلی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا 'آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح'۔ ان کے 31 سے زائد تحقیقی مقالے مؤقر جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ 21 سے زائد کتابوں کے مصنف، مرتب و مؤلف پروفیسر مظہر احمد نے تقریباً 21 قومی و بین الاقوامی سمینار میں شرکت کی۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، یونیورسٹی آف جموں اور NCPUL کے تحت منعقد چار روزہ ورک شاپ میں بھی شرکت کی۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا اور اردو اکادمی دہلی کے پروجیکٹ پر بھی انہوں نے کام کیا ہے۔

پروفیسر مظہر احمد کا خاص میدان تحقیق و تنقید ہے۔ ان کی ایک کتاب 'سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش' کی اشاعت پاکستان کے ایک معروف ناشر بُک کارنر نے کی ہے۔ 'میرے زمانے کی دلّی' (ملّا واحدی) ان کی اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ پروفیسر مظہر احمد نے نو کتابوں پر تبصراتی مضامین (Review Articles) بھی لکھے ہیں۔ یہ مضامین قومی آواز، ہماری زبان، نیا دور، آج کل اور ایوانِ اردو میں شائع ہوئے۔

تصانیف: ● آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح ● تاریخ یوسفی: یوسف خاں کمبل پوش ● شہر ملک اودھ: یوسف خاں کمبل پوش ● منٹو کے خاکے ● میرے زمانے کی دلّی (ملّا واحدی) ● مشتاق احمد یوسفی ● اقوال یوسفی

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 26 اکتوبر 1964ء مقام: دہلی۔

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو/اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ ادب، شاعری، طنز و مزاح، سفرنامہ

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ 'دلّی کی آخری شمع'

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ مشتاق احمد یوسفی، میر، غالب، اقبال

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ آب گم (مشتاق احمد یوسفی)

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ اردو کی تمام نصابی کتب

● آپ اردو کا کون سا اخبار/رسالہ خریدتے ہیں؟

■ انقلاب، ایوانِ اردو، آج کل

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ جی ہاں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ تمام مذاہب کا احترام کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرنا

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ نئی نسل تعلیم کی اصل روح سے بیگانۂ محض ہے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ کسی حد تک۔ مگر اردو کی تعلیم اطمینان بخش نہیں

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ اردو کو اسکولوں کی سطح پر عام کرنا اور اسے روزگار سے جوڑنا اشد ضروری ہے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ کسی حد تک۔ تعلیم کے میدان میں مزید کام کرنے کی گنجائش ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ دیوان غالب

● **مکمل پتہ:** 3183، کوچہ تارا چند، دریا گنج، نئی دہلی-110002

Mobile: 9212089910

سیر حاصل

نقشِ ضیاء الہدیٰ

از: محمد عارف اقبال

ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ (1918 ـ 12 جون 1998) کا شمار ان عبقری شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی قرآنی فکر اور انقلابی تربیت و تذکیہ سے کم سے کم تین نسلوں کو متاثر کیا۔ تربیت و تذکیہ اور افراد سازی ان کا خاص میدان تھا۔ وہ فطری انداز سے نوجوان نسل کی عملی تربیت میں یقین رکھتے تھے۔ خانقاہ فردوسیہ، بہار کے سجادہ نشیں مظفر بلخی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ نام ہے ایک نادرزمانہ شخصیت کا۔ ان کا خیال آنے پر ایک ایسی شخصیت ذہن میں ابھر کر سامنے آتی ہے جو اپنی ذات میں تو منفرد تھی لیکن سب کی مونس و غم خوار۔ بے نظیر ہو کر سب کے لیے ایک نظیر۔ شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کی رفیق۔ ایسی شخصیتیں کم ہی پردہ ظہور پر نمایاں ہوتی ہیں۔''

'نقشِ ضیاء الہدیٰ' کے مصنف و مرتب شاہد انور نے اس کتاب کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے: تاثرات، سرگزشت، شخصیت، یادداشت، تربیت۔ ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ کے شاگردوں میں شاہد انور ان کے بہت قریب رہے۔ حتیٰ کہ انتقال کے وقت ڈاکٹر صاحب کا سر شاہد انور کی گود میں تھا۔ اپنے 'پیش لفظ' میں شاہد انور لکھتے ہیں:

''1941 کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ملازمت کے بعد ٹریننگ کے لیے لکھنؤ گئے۔ وہاں ایک تحریکی رفیق سے

نقشِ ضیاء الہدیٰ

مصنف و مرتب: شاہد انور

صفحات: 338، قیمت: -/500، اشاعت: نومبر 2024

ISBN 978-93-83586-06-6

ناشر: منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

E-88A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

Mobile: 9811650228 - 9810650228

Email: manshuratindia@gmail.com

مولانا مودودیؒ کی کتاب 'پردہ' پڑھنے کو ملی۔ اس سے قبل بھی مولانا کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر 22 یا 23 سال کے قریب ہوگی۔ پٹنہ واپسی پر مولانا تقی الدین نعمانی مرحوم کے مکتبہ دین و دانش سے شائع شدہ تحریکی لٹریچر خرید کر پڑھنے لگے۔ 1946 میں الہ آباد کے اجتماع میں مولانا مودودی نے ان کی رکنیت کی درخواست منظور کی۔''

ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کی رکنیت راست بانیٔ تحریک علامہ مودودیؒ نے منظور کی تھی۔

تقریباً چھ سال کے بعد سیّد ضیاء الہدیٰ نے 15 اپریل 1953 کو اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے 1948 میں ہی بیچلر آف ہومیوپیتھی میڈیسن کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ پھر بطور ذریعہ معاش انہوں نے علاج معالجہ کو بطور پیشہ اختیار کرلیا۔

کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر ریحان غنی (ایڈیٹر اِن چیف روزنامہ 'تصدیق' پٹنہ) کے قلم سے ہے۔ ریحان غنی رشتے میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ کے اپنے بھانجہ ہیں۔ ڈاکٹر ریحان غنی اپنے 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ خوش حال دنیاوی زندگی کو 'فلاح' نہیں مانتے۔ یعنی فلاح کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کا واضح نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا میں جو آرام و عافیت ہے وہ فلاح نہیں ہے بلکہ آخرت میں کبھی ختم نہ ہونے والا آرام ہی اصل

تبصرے کے لیے اپنی کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیں۔ ایک نسخہ موصول ہونے پر تبصرہ شائع نہیں ہوگا۔ (ادارہ)

میں 'فلاح' ہے۔''

'تاثرات' باب کے تحت کتاب میں حکیم سیّد شاہ علیم الدین بلخی فردوسی، نسیم احمد عاجز، (مولانا) جلال الدین عمری، ڈاکٹر حسن رضا، محمود عالم (خدابخش لائبریری، پٹنہ)، ڈاکٹر احسن احمد (پٹنہ)، (مولانا) صدرالدین اصلاحی (اعظم گڑھ)، (مولانا) عبدالخبیر جعفری (صادق پوری)، حکیم سیّد شاہ تقی حسن بلخی اور رضوان احمد اصلاحی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ داعیِ قرآن تھے۔ قرآن مجید کی تفہیم کا وہ غیر معمولی ادراک رکھتے تھے۔ وہ قرآن کی تعلیمات کو درحقیقت زندگی میں اُتارنے کے قائل تھے۔ اس طرح سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی قرآن مجید کی عملی تفسیر محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پٹنہ میں درس قرآن کا ایسا سلسلہ شروع کیا جو جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماعات سے لے کر خانقاہوں اور دیگر حلقوں تک وسیع تھا۔ انھوں نے متعدد افراد بالخصوص نوجوانوں (بشمول خواتین) میں قرآنی مزاج پیدا کرنے کے لیے جگہ جگہ درس قرآن کا حلقہ بنایا۔ ڈاکٹر صاحب ایک شفیق مربی، مزکی، باوقار خطیب اور معلم تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی کام رسماً نہیں ہوتا تھا۔ وہ خیالی دنیا میں نہیں رہتے تھے بلکہ مطالعہ قرآن کے ذریعے اسلامی فکر کو نشو ونما دینے اور صالح اسلامی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی تربیت اور تزکیہ کا انداز اس قدر انوکھا اور غیر معمولی تھا کہ ان کے زیر اثر آنے والے افراد کے دل کی دنیا بدل جاتی تھی۔ وہ ہر شخص میں قرآن مجید کو پڑھنے اور سمجھنے کا داعیہ بیدار کرتے تھے تاکہ عملی زندگی میں قرآنی تعلیمات کو اُتارنے کا جوش و جذبہ پیدا ہوجائے۔ کتاب کے مصنف و مرتب لکھتے ہیں کہ خاص کر نوجوانوں کا وہ طبقہ جو جدید تعلیم کا دلدادہ تھا، ان کے سامنے جب ڈاکٹر صاحب قرآنی آیات کو سائنٹفک انداز میں پیش کرتے اور قرآنی آیات کو جدید سائنسی لب و لہجہ میں سمجھاتے تو وہ دنگ رہ جاتے اور ان کے فکر کے دروازے کھل جاتے۔ ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ (علیہ الرحمہ) نے اپنی کم سے کم پچاس سالہ داعیانہ حیات میں افراد سازی کا ایسا مثالی کام انجام دیا جس کی نظیر گزشتہ ستّر برسوں میں برعظیم میں شاید نہیں ملتی۔

'شخصیت' کے باب میں مظفر بلخی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر وقار انور، محمد جعفر، سیّد ابراہیم، اختر گیلانی، رضوان احمد اصلاحی، فضل کریم قاسمی، ابونصر فاروق، پروفیسر نہال احمد کریمی، اسلم جاوداں، نوشین تبسم اور خود کتاب کے مصنف و مرتب کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ تاہم ان میں مظفر بلخی، محمد جعفر، پروفیسر احمد سجاد، اختر گیلانی اور رضوان احمد اصلاحی کے مضامین پر خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

محمد جعفر صاحب (سابق نائب امیر، جماعت اسلامی ہند) کا مضمون (صفحہ 83 تا 113) اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب کی مقناطیسی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

محمد جعفر صاحب جن کا شمار ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ کے لائق و فائق شاگردوں میں ہوتا ہے، اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''... ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ کو میں نے کبھی عزیمت کے مقام سے نیچے نہیں پایا۔ جب ملا اُن کے قد کی بلندی میں اضافہ ہی محسوس ہوا۔ اللہ انہیں جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرے اور سایۂ رحمت میں رکھے۔ میرے نزدیک ماں باپ کے بعد ان سے بڑا کوئی محسن نہیں۔'' (صفحہ 106)

ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ نے 1960 کی دہائی ہی میں اپنی سرپرستی میں طلبا کا ایک حلقہ قائم کردیا تھا۔ پھر باضابطہ صوبہ بہار کی سطح پر 'حلقہ طلبا اسلامی بہار' کا قیام 1972 میں عمل میں آیا، جس کی منظوری مرکز جماعت اسلامی ہند نے دی تھی۔ محمد جعفر صاحب حلقہ طلبا اسلامی بہار کے ناظم اعلیٰ رہے اور جب طلبا کی آل انڈیا تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) غالباً 1983 میں قائم ہوئی تو اس کے پہلے صدر تنظیم محمد جعفر صاحب بنائے گئے۔ طلبا کی اس تنظیم (SIO) کو امیر جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ تنظیم آج بھی پورے ملک میں فعال رول ادا کررہی ہے۔

ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ نے جماعت اسلامی ہند میں تقریباً 50 سالہ خدمات انجام دینے کے بعد جب اس تحریک سے علاحدہ ہونے کا فیصلہ کیا تو ان کا یہ فیصلہ خالصتاً عقیدہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ذاتی پسند یا ناپسند ہونے کو دخل نہیں تھا۔ بلکہ

علاحدہ ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہی تھا کہ دیگر تمام مذہبی و دینی جماعتوں میں صرف جماعت اسلامی ہی اپنے نصب العین کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے۔ جعفر صاحب نے اپنے مضمون میں جماعت اسلامی سے ڈاکٹر صاحب کی علاحدگی کے بارے میں لکھتے ہوئے جماعت اسلامی ہند کے اساسی رکن حسنین سیّد صاحب (مرحوم) کے اس خط کا ذکر کیا ہے جسے انہوں نے تحریک کے بزرگ رہنما (مولانا) صدرالدین اصلاحی صاحب کو لکھا تھا۔ انہوں نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''بالآخر شیطان نے ڈاکٹر صاحب جیسے شخص کو بھی اُچک لیا۔'' اس تبصرہ پر گرفت کرتے ہوئے (مولانا) صدرالدین اصلاحی (علیہ الرحمہ) نے حسنین سیّد صاحب پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ میری نظر میں پوری جماعت میں ان سے زیادہ مخلص اور متقی شخص کوئی نہیں ہے اور میں ان کے دلائل سے، اگرچہ اتفاق نہیں رکھتا، لیکن ان میں وزن ہے، یہ اظہار کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ آپ کو اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔'' حسنین صاحب نے اس پر معذرت اور افسوس کیا۔ (صفحہ 110 تا 111)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''جب ساری دنیا میں امیر وغریب ہر شخص کے گھر میں بجلی ہوتی اور بجلی کے پنکھے ہوتے، اس وقت بھی ان کے گھر میں لالٹین استعمال ہوتی اور ہاتھ کا پنکھا۔ ایک مٹی کا گھڑا اور سفال پوش کمرہ اور اس میں ایک اونچی پلنگ پر چادر بچھی ہوئی اور اس کے ایک طرف تین لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی ہوتیں۔ یہ ڈرائنگ روم تھا اس شخص کا جس کا نام ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ تھا جو بہار کی جماعت اسلامی کا امیر تھا، جو تحریک اسلامی کا قائد تھا اور دینی مدرسوں اور محفلوں کی رونق تھا۔'' (صفحہ 63 تا 64)

محمود عالم (14 جولائی 1952 ۔ 24 مارچ 2007) جو خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری سے وابستہ رہے، پھر اس سے الگ ہونے کے بعد ہفتہ وار نقیب (پھلواری شریف، پٹنہ) کے ایڈیٹر بنائے گئے، اس کے بعد اپنے ایک مخلص دوست کے تعاون سے وہ سعودی عرب (ریاض) میں WAMY (ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ) کے لائبریرین مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے تقریباً 15 سال خدمات انجام دیں۔ ان کا بھی ایک مختصر مضمون کتاب کی زینت ہے۔ محمود عالم حلقہ طلبا اسلامی بہار کے ترجمان ماہنامہ 'رفیق' کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ کے قرآنی افکار کو 'آیات اللہ' کے عنوان سے کئی قسطوں میں ماہنامہ رفیق میں شائع کیا تھا۔ محمود عالم (مرحوم) لکھتے ہیں:

''... ڈاکٹر صاحب تکوینی آیات کی جیسی تفسیر کرتے تھے ویسی تفسیر نہ کہیں پڑھی اور نہ سنی۔ یہ اُن کا خاص فن تھا۔ قرآن پاک پر جتنا انہوں نے غور وفکر کیا تھا اس عہد میں شاید ہی کسی مفسر نے کیا ہو۔ مولانا امین اصلاحی، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے باضابطہ تفسیریں لکھی ہیں۔ لیکن جن مضامین تک ڈاکٹر صاحب کی رسائی ہوئی اس عہد کے کسی مفسر کو نہیں ہوسکی۔ آج جو جدید ترین سائنسی انکشافات نے کلامی مسائل پیدا کردیے ہیں ان کا جواب اور حل صرف ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ صاحب کے مضامین اور درس قرآن میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو 'آیات اللہ' کے نام سے مضامین لکھے ہیں یا جو درس قرآن، تکوینی آیات کے دیے ہیں ضرورت ہے کہ ان کا انگریزی اور عربی ترجمہ شائع کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ہی کی جرأت اور ہمت تھی کہ انہوں نے آج سے تیس سال پہلے صاف صاف فرمایا کہ انسان قربِ قیامت کے زمانے تک اس قابل ہوجائے گا کہ مُردے میں جان ڈال سکے۔'' (صفحہ 08)

جماعت اسلامی حلقہ بہار کے موجودہ امیر رضوان احمد اصلاحی لکھتے ہیں:

''میرا ذاتی احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب باقاعدہ قرآن کی تفسیر لکھتے تو ذخیرہ تفاسیر میں ایک نیا اضافہ ہوتا اور جدید ذہن خصوصاً سائنس اور ٹکنالوجی سے متاثر افراد کے لیے وافر مقدار میں علمی، فکری اور روحانی غذا کا سامان ہوتا۔ قرآن اور اسلام پر ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا۔ جدید علوم وفنون کا تزکیہ ہوتا۔'' (صفحہ 134 تا 135)

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر سیّد ضیاء الہدیٰ کے زہد اور تقویٰ اور قرآن فہمی کو اجاگر کرنے والے کئی مضامین شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے۔ لیکن ابونصر فاروق

صاحب کے مضمون کا تذکرہ ضروری ہے۔ مضمون نگار نے کئی مقام پر اپنے لیے لفظ 'جانشین' استعمال کیا ہے۔ کیا 'جانشین' کا مفہوم یہی ہے کہ بہ زعم خود کوئی کسی کا 'جانشین' بن جائے۔ دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب پر انہوں نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ 'بدگمان ہوگئے' اس سے مضمون نگار کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ (صفحہ 145 تا 146)

بشری تقاضے کے تحت ڈاکٹر صاحب میں بعض کمزوریاں ہوسکتی ہیں لیکن ان پر 'بدگمانی کا الزام' انتہائی رکیک ہے۔

حیرت ہے کہ کتاب میں حلقہ طلبا اسلامی بہار سے خاص تعلق رکھنے والے کئی افراد کے تاثرات شامل نہیں ہیں۔ احمد علی اختر صاحب کے مضمون سے بھی یہ کتاب خالی ہے۔ اسی طرح لندن میں مقیم ڈاکٹر جاوید اختر اور مظفر پور کے پروفیسر ابوذر کمال الدین کے مضامین۔ اگر اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی خیالات شامل نہ کیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ مثلاً چائے اور پان سے متعلق باتیں۔ اسی طرح طنز و مزاح وغیرہ۔ 'نذر ضیاء الہدیٰ' میں شامل اسرار عالم صاحب کا ایک مضمون بھی اس میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت پر شاید یہ پہلا مضمون تھا جو 'اردو بک ریویو' (شمارہ جولائی تا اگست 1998) میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''سیّد صاحب جو سیّد صاحب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے مشہور تھے اور قرآن لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ تلاوتِ قرآن، تدبر فی القرآن، تمسک بالقرآن اور تمسک بالسّنت ان کی زندگی کے ایسے لوازم تھے کہ کسی لمحے کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ان سے خالی تھا، مشکل ہے۔ حتیٰ کہ ایک رفیق نے بتایا کہ آپریشن کے بعد جب وہ Anaesthesia کی پوری طرح گرفت میں تھے اور طبّی نقطہ نظر سے بے ہوش تھے، ان کا قلب بیدار تھا حتیٰ کہ اُن کے ہونٹ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ یہ مدّت ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ رہی۔ ایسا صرف اس شخص سے ممکن ہے جس کے شعور، تحت شعور حتیٰ کہ لاشعور پر بھی قرآن کا قبضہ ہو۔'' (اردو بک ریویو، صفحہ 58)

راقم الحروف کا رابطہ بھی کسی درجے میں ڈاکٹر صاحب سے تھا۔ انتقال سے غالباً تین ماہ قبل جب دہلی سے اپنے وطن کی طرف گیا تھا تو عالم گنج، پٹنہ میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس دوران میں راقم السطور نے ڈاکٹر صاحب کے روحانی کمال کا مشاہدہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر نے مجھے بے حد مغموم کر دیا تھا۔ جولائی 1998 کی کسی تاریخ کو خاکسار نے دہلی میں مقیم چند رفقا کے تعاون سے ڈاکٹر صاحب کو یاد کرنے کے لیے ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام کے لیے مرکز جماعت یا ایس آئی او ہیڈ کوارٹرس کا ہال نہیں ملا تو 'دی اسکالر اسکول' (ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی) کے صحن میں مرحومہ صفیہ اقبال سے خصوصی اجازت کے بعد تعزیتی پروگرام رکھا گیا۔ اس میں جماعت کی طرف سے سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر پرواز رحمانی (مرحوم) اور انتظار نعیم صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جنت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور جن افراد کی تربیت اور تزکیہ میں ڈاکٹر صاحب نے اہم کردار ادا کیا ہے ان کی ذات سے اسلام اور اُمت مسلمہ کو تقویت عطا ہو۔ آمین!

❑❑❑

تازہ کتاب

ابرار فائق
ایک قلندر مزاج شاعر

مرتب: پروفیسر محمد نعیم فلاحی

صفحات: 176 قیمت: -/300 اشاعت: 2026

ISBN 978-93-90579-59-4

ناشر: القاسم پبلی کیشنز، سوائی مادھوپور (راجستھان)

Mobile:9414308409

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی-110002

Mobile: 9953630788

انگریزی کتاب
نقدوتبصرہ

اقتدار کے ایوانوں کی گواہی یا یادداشت کی بھول بھلیّاں؟
شاہد صدیقی کی خودنوشت کا تنقیدی جائزہ

از: افتخار گیلانی☆

اردو دنیا میں دہلی کی تہذیبی روایت کا ذکر ہو اور دہلوی و صدیقی خاندانوں کا حوالہ نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ ایک طرف محمد یوسف دہلوی اور ان کے فرزندوں نے شمع، شبستان، بانو اور کھلونا جیسے رسائل کے ذریعے اردو کی مقبول ثقافت کو نئی جہت دی؛ دوسری طرف بلی ماران کے صدیقی خاندان نے ہما، ہدیٰ، پاکیزہ آنچل اور نئی دنیا کے ذریعے صحافت میں اپنا اثر قائم رکھا۔ انہی صدیقی خاندان کے چشم و چراغ شاہد صدیقی کی انگریزی تصنیف I, Witness: India from Nehru to Narendra Modi محض ایک خودنوشت نہیں، بلکہ نصف صدی پر پھیلی سیاسی گواہی کا دعویٰ بھی ہے۔

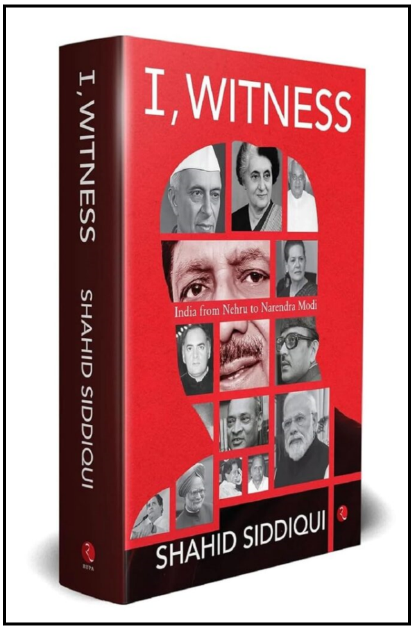

کتاب کا بنیادی وصف یہ ہے کہ مصنف نے خود کو اقتدار کی راہداریوں کا عینی شاہد قرار دیا ہے۔ اندرا گاندھی سے لے کر نریندر مودی تک، راجیو گاندھی، پی وی نرسمہا راؤ، سونیا گاندھی اور اٹل بہاری واجپائی تک، ان سب سے ملاقاتوں اور پس پردہ گفتگوؤں کا احوال کتاب میں بکھرا ہوا ہے۔ یہی پہلو اسے دلچسپ بھی بناتا ہے اور متنازع بھی۔

کشمیر کے باب میں کتاب کا بیانیہ سب سے زیادہ سوالات کو جنم دیتا ہے۔ مصنف نے اکتوبر 1947 کے واقعات بیان کرتے ہوئے رفیع احمد قدوائی کو اس فیصلہ کن موڑ کا محرک بتایا ہے جب جواہر لعل نہرو نے کشمیر میں فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس بیان سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نہرو تذبذب کا شکار تھے اور قدوائی کی وارننگ نے انہیں آمادہ کیا۔ لیکن دستیاب تاریخی ریکارڈ اس سادہ بیانیے کی تائید نہیں کرتا۔ گورداسپور کی تقسیم، پٹھانکوٹ کا بھارت کو ملنا، اور گوپال سوامی آیانگر کی سرگرمیاں ظاہر کرتی ہیں کہ فیصلہ پہلے سے طے شدہ سمت میں بڑھ رہا تھا۔ مصنف کا انداز یہاں واقعاتی پیچیدگی کو سنی سنائی باتوں کی سطح پر لے آتا ہے۔

اسی طرح 1983 کے جموں و کشمیر انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے ارون نہرو پر فرقہ وارانہ سیاست کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ مگر تاریخی تناظر میں اندرا گاندھی کا کردار کہیں زیادہ براہ راست دکھائی دیتا ہے۔ سری نگر کے اقبال پارک کا وہ مشہور واقعہ، جس میں ان کی تقریر کے دوران ہنگامہ ہوا، اور اس کے

☆ سینئر جرنلسٹ، انقرہ، ترکیہ

بعد جموں میں انتخابی حکمت عملی کی تبدیلی، اس پورے باب کو محض مشیروں کی چال کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف بعض مقامات پر زمانی ترتیب سے بھی غافل دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1983 میں عسکریت پسندی کے حوالے دینا، جبکہ مسلح تحریک کی شدت 1987 کے بعد سامنے آئی، تاریخی تسلسل سے بےخبری کی علامت ہے۔

روبیہ سعید کے اغوا کے باب میں لشکر طیبہ کا ذکر بھی اسی نوعیت کی لغزش ہے، کیونکہ اُس دور میں اس تنظیم کا وجود کشمیر میں نمایاں نہیں تھا۔ اسی طرح 2003 میں واجپائی کے اعلان سے سری نگر۔مظفر آباد بس سروس کو جوڑ دینا، جبکہ اس کا افتتاح 2005 میں منموہن سنگھ نے کیا، کتاب کے واقعاتی اعتماد کو کمزور کرتا ہے۔

کتاب کا ایک دلچسپ مگر متضاد پہلو بھارتی مسلمانوں کے بارے میں عمومی بیانات ہیں۔ 1965 کی جنگ کے تناظر میں مصنف نے مسلمانوں کی وفاداری کو بھرپور انداز میں سراہا ہے، مگر اسی کتاب میں یہ اعتراف بھی ملتا ہے کہ ان کے اخبار کی ناکامی کی ایک وجہ شمالی ہند کے مسلمانوں میں پاکستان کے لیے نرم گوشہ تھا۔ یہ دو متضاد دعوے کسی جامع توضیح کے بغیر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

بنگلہ دیش کی آزادی اور شملہ معاہدے کے حوالے سے مصنف نے اندرا گاندھی کی حکمت عملی کو سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلحہ دینا آسان اور واپس لینا مشکل ہوتا ہے، اور بھارت نے اس ممکنہ انتشار سے خود کو بچایا۔ یہ تجزیہ نسبتاً متوازن معلوم ہوتا ہے، مگر یہاں بھی ذاتی مشاہدے اور تاریخی تحقیق کے درمیان حد فاصل دھندلا جاتی ہے۔

’نئی دنیا‘ کے اجرا کو مصنف نے اردو صحافت میں ’انقلاب‘ قرار دیا ہے، حالاں کہ اس کا انداز چیختی سرخیوں اور جذباتی بیانیے سے عبارت تھا۔ خود مصنف جذباتی سیاست پر تنقید کرتے ہیں، مگر ان کی عملی صحافت اسی اسلوب کی علمبردار دکھائی دیتی ہے۔ یہ تضاد کتاب کے مزاج میں بار بار جھلکتا ہے۔

راجیو گاندھی کے قتل کے باب میں یاسر عرفات، موساد اور ایل ٹی ٹی ای کے مبینہ روابط کا ذکر سنسنی خیز ہے، مگر شواہد کی کمی اسے قیاس آرائی کے قریب لے جاتی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے سلسلے میں پی وی نرسمہا راؤ کا رول اس کتاب کی جان ہے۔ مگر ان کئی لغزشیں جیسے 1989 کے انتخابات میں صدر کے آر نرائنن کا حوالہ دینا، جب کہ اس وقت آر وینکٹ رمن صدر تھے، ایک بنیادی تاریخی خطا ہے۔

کتاب کے آخری حصوں میں مودی دور کا ذکر ہے۔ مصنف نے مودی کے ساتھ انٹرویو، احمد پٹیل کی ناراضی، اور امیت شاہ سے ملاقات جیسے واقعات بیان کیے ہیں۔ امیت شاہ کا یہ جملہ کہ انتخابات جذبات سے جیتے جاتے ہیں، کتاب کے سیاسی فلسفے کا خلاصہ بن جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا خود مصنف اس جذباتی سیاست سے الگ رہ سکے؟

مجموعی طور پر یہ کتاب اقتدار کے قریب رہنے والے ایک صحافی و سیاست دان کی ذہنی اور سیاسی دنیا کا آئینہ ہے۔ اس میں کئی قیمتی واقعات اور ذاتی مشاہدات محفوظ ہیں۔ مگر ساتھ ہی زمانی اغلاط، مبالغہ آمیز دعوے اور تحقیقی کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ اسے ایک عینی شاہد کی روداد کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے، لیکن مستند تاریخی ماخذ کے طور پر قبول کرنا احتیاط کا متقاضی ہے۔

شاہد صدیقی نے اپنے عہد کی سیاست کو جس زاویے سے دیکھا، وہ اس کتاب میں پوری قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اقتدار کے قریب رہنے کی قربت درستگی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی یہ ایک بڑی کمزوری ہے۔

□□□

I, WITNESS
India from Nehru to Narendra Modi
By: Shahid Siddiqui
Pages: 398 Edition: 2025 Price: Rs. 795/-
ISBN 978-93-7003-195-1
Published by: Rupa Publications India Pvt. Ltd.
161-B/4, Gulmohar House, Yusuf Sarai
Community Centre, New Delhi - 110049

تعمیر حیات کے زرّیں اصول

از: محمد عارف اقبال

علامہ وحیدالدین خان (1925-2021) نے اپنا منفرد رسالہ 'الرسالہ' کے نام سے 1976 میں جاری کیا تو چند ہی شماروں کے بعد اسے گراں قدر مقبولیت حاصل ہوگئی۔ 'الرسالہ' کی دو خصوصیت بے حد نمایاں تھیں۔ اول یہ کہ معیاری کاغذ، طباعت اور اس کا کتابی سائز۔ دوسری اہم خصوصیت اس میں شامل مضامین کی ندرت۔ مضمون مختصر لیکن تعمیر شخصیت کا داعی۔ کسی مضمون سے ایسا لگتا جیسے کتابِ زندگی کھل گئی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا کسی مضمون میں رازِ حیات پوشیدہ ہو۔ 'الرسالہ' کی انفرادیت یہ رہی کہ اس میں عصر حاضر کی رعایت سے عنوان قائم کیا جاتا۔ بات فلسفیانہ لیکن بصیرت افروز ہوتی اور اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے مثال کا سہارا لیا جاتا۔ مثال منتخب کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ انبیاء و رسل، صحابہ کرام سے لے کر تاریخی شخصیت، سائنس داں، مورخ، ادیب، طلبا، ادنیٰ و اعلیٰ تاجر، ملازمت پیشہ وغیرہ سبھی شامل ہوتے۔ مثالیں حقائق سے موثق ہوتیں۔ ان مضامین کی ایک اہم اور بڑی خصوصیت تھی ان کے پیش کرنے کا دل نشیں انداز اور سادہ ادبی اسلوب۔ مطالعہ کے دوران میں اس کے قارئین شاید ہی کبھی الجھن محسوس کرتے ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ علامہ وحیدالدین خان کو کسی واقعہ کو بیان کرنے کی تمثیل نگاری میں ملکہ حاصل تھا تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ جدید اردو ادب میں خان صاحب شاید اس فن کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔

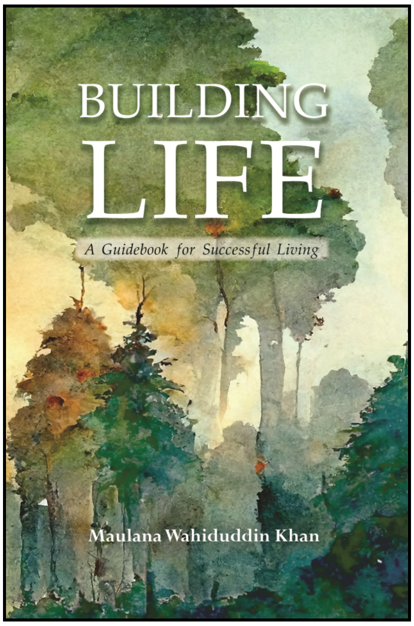

وحیدالدین خاں صاحب امن کے داعی تھے۔ وہ اسلام میں روحانی تعقل کے ساتھ اجتماعی معاملات میں رسول اللہ (ﷺ) کے لطیف اور بے ضرر طریقہ کار (Approach) کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم (ﷺ) کے ذریعے کیے گئے معاہدوں میں خان صاحب 'صلح حدیبیہ' سے بے حد متاثر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانی طرز حیات کا ہر مشکل مرحلہ مثبت طریقے سے حل کیا جائے۔ وہ منفی سوچ (Negative Approach) کو پسند نہیں کرتے تھے۔

زیر نظر کتاب "Building Life: A Guidebook for Succesful Living" دراصل خان صاحب کی اردو کتاب 'تعمیر حیات' (اشاعت اول 2000ء) کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول کا جلی عنوان Right Thinking ہے۔ اسی طرح دیگر چار ابواب کے عنوانات ہیں:

2. The Law of Nature

3. In the Discourse of Occurrences

4. The Seerat of Success

5. The Guide to Life

کتاب کی ابتدا ہی میں باب اول کے جلی عنوان "Right

Building Life
A Guidebook for Successful Living
By: Maulana Wahiduddin Khan
Translated & Edited by: Prof. Farida Khanam
Dr. Rajat Malhotra, Farhad Ahmad
Pages: 304, Ist Edition: 2025, Price: not mentioned
Published by: Goodword Books
A-21, Sector-4, Noida - 201301 (NCR)
Mobile: 8588822672

"Thinking" کے تحت خاں صاحب نے دس نکات کی وضاحت کردی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں سے یہ دس نکات مشروط ہیں۔ یہ دس نکات قابل توجہ ہیں:

1. Life as an Art, 2. Humans as Thinking Beings, 3. Ignore the Problem, 4. Avoid Negative Reactions, 5. Overlook Imaginary Threats, 6. Respond Positively, 7. Avoid Dicotomous Thinking, 8. Principle of Adjustment, 9. The Art of Differentiation, 10. The Art of Learning.

درست سوچ (Right Thinking) کے حوالے سے خاں صاحب نے انسان اور حیوان کی مثال دی ہے۔ انسان خطا کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ خالق کائنات کی طرف سے اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی بے نظیر قوت عطا کی گئی ہے۔ اس کے برعکس حیوان انسان کی طرح خطا کا ارتکاب نہیں کرسکتا ہے۔ وہ اپنے خالق کے ودیعت کردہ جبلت حیوانی کے تابع ہوتا ہے۔ جبکہ انسان درست اور غلط دونوں نتائج اخذ کرسکتا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیت کو نشوونما دے تاکہ وہ کسی بھی معاملہ میں درست فیصلہ کرسکے اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔

علامہ وحیدالدین خاں ایک مذہبی رہنما تھے۔ اسلام سے ان کو عشق تھا لیکن وہ اسلامی تعلیمات کو ہمیشہ عصر سے ہم آہنگ کرتے ہوئے عملی شکل تجویز کرتے تھے۔ وہ دوسو سے زائد کتابوں کے مصنف اور قرآن حکیم کے مترجم ومفسر تھے۔ 2001 میں اپنے عالمی امن منصوبے کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے ایک ادارہ "Centre for Peace and Sprituality International" کے نام سے قائم کیا۔ CPS انٹرنیشنل نیٹ ورک اس کے بانی کے انتقال (2021) کے بعد بھی جاری ہے اور اس کے کارکنان خاں صاحب کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کرنے میں مصروف ہیں۔

اس وقت دنیا میں Motivational Lectures کا رواج عام ہوگیا ہے۔ نئی نسل کے لیے اس طرح کے لکچرس میں چونکہ بڑی کشش ہوتی ہے لہٰذا یہ لکچرس آڈیٹوریم سے باہر سوشل میڈیا کے ذریعے بھی عام ہو رہے ہیں۔

1936 میں ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie) کی کتاب "How to win Friends & Influence People" شائع ہوئی تو اس کتاب کی دھوم ہوگئی۔ پتہ نہیں دنیا کی کتنی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ آج بھی یہ کتاب انگریزی کے علاوہ ہندی اور ملک کی دیگر علاقائی زبانوں میں موجود ہے۔ اس طرز پر لکھنے والوں میں Napoleon Hill, Sean Covey, Caral S. Dweck, Angela Duckworth, James Clear and Robin Sharma پیدا ہوئے۔ انسانی طرز حیات اور مسائل پر مشتمل اس طرح کی ہزاروں کتابوں کا سیلاب ہے جس سے موجودہ نسل استفادہ کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن ان کتابوں کا مرکزی موضوع اس فانی دنیا میں ہی کامیاب ہونا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے ہم دنیا کی رنگینی و آسائش سے لطف اندوز تو ہوسکتے ہیں لیکن قارئین اُس حقیقی دنیا سے بےخبر رہ جاتے ہیں، جس کا سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب گوشت پوست کا یہ جسم روح انسانی سے خالی ہوجاتا ہے۔ چونکہ جسم کی اصل روح ہے اس لیے مغربی دنیا کی شائع کردہ ان کتابوں میں طرز حیات کے لیے بیش بہا معلومات کے باوجود، روحانی ترقی کے راز سے یہ کتابیں خالی ہیں۔

وحیدالدین خاں صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف انسان کی موجودہ دنیاوی زندگی بہتر ہوسکتی ہے بلکہ یہ کتاب اُس روحانی دنیا کی خبر دیتی ہے جہاں انسان کا حقیقی ابدی ٹھکانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خاں صاحب نے قرآن مجید کی اس آیت کی روشنی میں رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مومن بندہ یہ دعا کرتا ہے:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار۔

انفرادی طور پر خاں صاحب نے ذہنی وفکری تطہیر کا فریضہ بخوبی ادا کیا ہے۔'الرسالہ' جاری کرنے سے بہت قبل خاں صاحب کی ایک کتاب 'قرآن کا مطلوب انسان' شائع ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاں صاحب کے نزدیک انسان کا منصبی فریضہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے احکام کے مطابق اپنی زندگی کو نمونہ بنائے۔ اس کے لیے انہوں نے عصری تقاضوں بالخصوص ہندوستان کے تکثیری سماج میں رہنمائی اور دعوت کا جدید طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے انفرادی طور پر بے شمار لوگ خاں صاحب کے گرویدہ ہوئے اور ان کے 'دعوتی مشن' کا ساتھ دینے لگے۔ البتہ ملّی، سیاسی وسماجی قیادت سے خاں صاحب کے اختلافات ہمیشہ برقرار رہے۔ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر خاں صاحب کا ساتھ نہیں دیا۔

'تعمیر حیات' کا یہ انگلش ایڈیشن نئی نسل اور انگلش زبان سے خاص تعلق رکھنے والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس لحاظ سے بااختیار اور آزاد پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دنیا میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔ لیکن اسے متنبہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ ہے۔ اس لیے سوچنے سمجھنے اور زندگی کے درست فیصلے کے لیے علامہ وحیدالدین خاں کی اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ زندگی بڑی انمول نعمت ہے۔ قدم قدم پر دوست مل جاتے ہیں جن کی صحبت سے گمراہ ہونے کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کتاب کی رفاقت اور اس کی دوستی پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ کتاب کا مصنف اپنے ربّ کے قریب ہو اور ایمانداری کے ساتھ حکمت و دانائی کی بات کرتا ہو تو اس کی کتاب حق رفاقت ادا کرسکتی ہے۔ کتاب کے بارے میں پبلشر کا یہ دعویٰ "A Guidebook for Successful Living" حقیقت سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

□□□

مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) دہلی

شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی مفکر ملت مفتی اعظم مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد صاحب کی سرپرستی میں عوامی فلاح وبہبود کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس سے مستحقین اور ضرورت مند عوام، طلبا اور طالبات کی خدمت و معاونت کا سلسلہ جاری ہے۔ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے 12A اور 80G بھی مل گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کا اصل مقصد مذہبی اور عصری تعلیم و تربیت کا فروغ، صحت اور انسانی خدمت ہے۔ مزید معلومات کے لیے موبائل نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

حماد احمد

Mazharul Uloom Educational Charitable Trust (Regd.)

6479/11, G.F., Katra Bariyan, Fatehpuri, Delhi - 110006

Axis Bank (Chandni Chowk Branch)

A/c No. 920010070673650 IFSC: UTIB0000254

Bombay Mercantile Co-Operative Bank Limited

A/c No. 200100100068463 IFSC: BMCB0000044

The Trust has exemption from Income Tax Under 12A & 80G

Email: trust.mueducation@gmail.com

Mobile: 9899663435 / 9873684293

Advt./01/2026

اردو کے ممتاز صحافی اور محقق محمد طارق غازی کے قلم سے

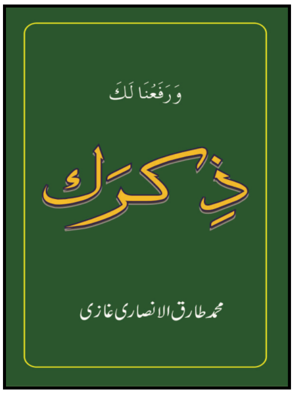

Pages: 744 - Price: Rs. 500/-

سیرت کی کتب میں عموماً واقعات ملتے ہیں لیکن تاریخی تناظر میں ان واقعات کا عمرانی اور سیاسی تجزیہ نہیں ملتا جن کے اثرات مکہ اور مدینہ کی سیاست اور اقتصادیات پر نظر آئے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب نہ صرف منفرد ہے بلکہ پہلی بار سیرت کے عمرانی، سیاسی اور اقتصادی اقدامات کا تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے۔

سوانح ہاجرہ نازلی

یہ سوانحی واقعات مشہور ادیبہ ہاجرہ نازلی کے ہیں۔ ان کے اٹھارہ ناول اور ستّر اسّی کے قریب افسانے اور کہانیاں نیز مختلف موضوعات پر مضامین و مکالمے ماہنامہ بانو دہلی، حریم لکھنؤ اور مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان سوانحی واقعات کو ان کی بیٹی شہناز کنول غازی (علی گڑھ) نے مرتب کیا ہے۔

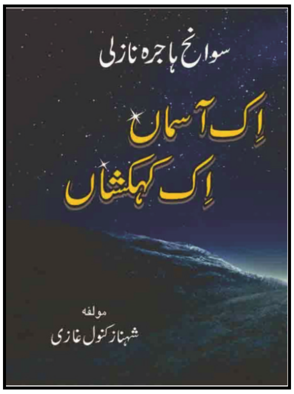

Pages: 348
Price: Rs. 300/-

رابطہ

IQRA EDUCATION FOUNDATION
A-2 Firdaus, 24 S.V. Savarkar Road, Mahim West
Mumbai - 400016 **Cell: 9359210010**

URDU BOOK REVIEW
1739/104, First Floor, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj,
New Delhi - 110002 **Tel.: 011 - 44753890 / 9953630788**

Advtt. 01/2026

نقد و تبصرہ

لایموت: ایک خودنوشت

مصنف: پروفیسر راشد شاز

تبصرہ: مشتاق الحق احمد سکندر☆

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے برج کورس کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد شاز کی کتاب 'لایموت: ایک خودنوشت' پر 'New Age Islam' کے لیے سری نگر کے معروف مصنف و ایکٹیوسٹ مشتاق الحق احمد سکندر کا تجزیہ وتبصرہ انگلش میں لکھا گیا تھا۔ اس تبصرہ و تجزیہ کا اردو ترجمہ 'اردو بک ریویو' کے قارئین کی نذر ہے۔ توقع ہے کہ اس تبصرے کی اشاعت سے قارئین نہ صرف مستفید ہوں گے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے ملّی وسیاسی قائدین کی خدمات اور افکار کو سمجھنے کے لیے راشد شاز کی اس 'خودنوشت' کے مطالعہ کا ان میں داعیہ پیدا ہوگا، اور ملک کی نازک وسنگین صورت حال میں افہام وتفہیم کی فضا ہموار ہوگی۔ (**مدیر**)

راشد شاز کی سوانح عمری 'لا یموت: ایک خودنوشت' بھارتی مسلمانوں کی پُرآشوب تاریخ اور ان کی مضبوط روح کی ایک عظیم گواہی ہے، جو ایک فرد کی زندگی کے انفرادی اور پُراثر عکس کے ذریعے بیان ہوتی ہے۔ یہ سوانح عمری صرف اپنی ذات کی زندگی کا احاطہ نہیں کرتی؛ بلکہ ایک انتہائی محنت سے ترتیب دیا گیا تاریخی اور سیاسی سماجی دستاویز ہے جو قتلِ عام، نسلی امتیاز، فرقہ وارانہ تشدد اور منظم حاشیہ بندی جیسے حقائق سامنے لاتی ہے۔

ابتدا ہی میں راشد شاز قاری کو تقسیمِ ہند کی خونریز حقیقت سے روبرو کراتے ہیں، ایک ایسا زلزلہ جس نے عام لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔ تقسیم کے فرقہ وارانہ قتلِ عام معصوموں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ مصنف اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ بچپن میں موت ان کے لیے بالکل نیا تجربہ تھی ایک ایسا واقعہ جس نے ان کے بچپن اور ان کے نقطۂ نظر دونوں کو بنیادی طور پر بدل دیا۔ وہ تقسیم کے لمبے سائے کو صرف افراد تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے پورے معاشرے پر ڈالتے ہیں۔ خاندانوں، گھروں اور زندگیوں کی تباہی اس دور کا کوئی منجمد واقعہ نہیں بلکہ ایک زندہ زخم ہے جو اُن لوگوں کی یادوں میں زندہ ہے جو ابھی تک اس درد کو سمجھنے، اسے بھولنے اور اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ فسادات منفرد اور عارضی واقعات نہیں بلکہ ایسے منظم انفجارات تھے جو متنوع مذاہب و ثقافتوں کے درمیان نازک توازن کو توڑتے رہے۔ خاص طور پر مصنف اس بات پر توجہ دلاتے ہیں کہ ایک مذہبی تنظیم اس وقت بھی کانگریس کی حمایت کرتی رہی جب کانگریس خود فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث پائی جا رہی تھی۔ یہ تضاد اقلیتوں کی پیچیدہ اور اکثر دردناک سیاسی مجبوریوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ابتدائی یادوں میں جادوئی واقعات کے ساتھ فرقہ وارانہ کشمکش کا ذکر اور مسجدِ اقصی میں لگنے والی آگ کا واقعہ صرف ذاتی یادگاریں نہیں بلکہ بھارتی مسلمانوں کی وسیع تر روحانی اور اجتماعی بے چینی کی علامت ہیں۔

سوانح عمری میں مسلمان معاشرے کے اندرونی دراڑوں، خاص طور پر 'اِجلاف' (نچلے طبقات) اور 'اشراف' (اعلیٰ طبقات) کے درمیان تقسیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ راشد شاز ان تقسیموں کو بہت نرمی اور باریکی سے بیان کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ درجہ بندی ظاہری شکل، سماجی تعلقات اور روزمرہ کی شناخت دونوں میں گھل مل چکی تھی۔ ان کے تجزیے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اسی طرح کے نازک سیاسی اتحاد، بقا کی حکمتِ عملیاں، اور ذات، طبقہ اور مذہب کے امتزاج نے مسلمانوں کی زندگیوں کو کس طرح سے ڈھالا۔

بنگلہ دیش کی تخلیق ایک اور اہم باب ہے جسے شاز نے

صفحات: 428 قیمت:-/450 اشاعت: ستمبر 2021
ISBN 978-93-81461-30-3
ناشر: ملّی پبلی کیشنز، ملّی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

بھارتی مسلمانوں پر اس کے اثرات کے تناظر میں بہت حساسیت سے بیان کیا ہے۔ 1971 کے بعد بنگلہ دیش کا وجود نئے قومی تصورات، آبادیاتی تبدیلیوں اور سیاسی توازن میں تبدیلی کے ساتھ آیا، جس نے بہت سے بھارتی مسلمانوں کو شبہ اور بے گانگی کی درمیانی حالت میں ڈال دیا۔

اپنے بیان میں راشد شاز سیاسی قیادت اور مذہبی اتھارٹی دونوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی کی کانگریسی سیاست کی مخالفت، خاص طور پر اندرا گاندھی کے دور میں ہندتو کے اثرات سیاسی خطوطِ تقسیم کو واضح کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں شک اور خوف عام تھا، مسلمانوں کی بقا مشکل تھی، اور خود مسلمانوں کے درمیان کانگریس کی حمایت کرنے والے اور اس کے مخالف گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اسی کی عکاسی اردو زبان کے زوال میں بھی نظر آتی ہے، جو مسلمانوں کی شناخت سے گہرائی سے جڑی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ اسے صرف 'مسلمانوں کی زبان' کے طور پر تنگ کر دیا گیا۔ اردو کا پسپا ہونا مسلمانوں کی ثقافتی اور لسانی حاشیہ بندی کی ایک علامت ہے، جہاں ان کی ادبی اور فکری وراثت کو نظرانداز کیا گیا اور تدریجاً مٹایا جانے لگا۔

بھارت میں ایمرجنسی (77–1975) کو مسلمانوں کے لیے بے مثال سختیوں کا دور قرار دیا گیا ہے۔ راشد شاز اپنے والد کی گرفتاری، گھر اور دکان کی سیل بندی کا ذکر کرتے ہیں، جو اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی خاموشی اور علاحدگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جمعیت علماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (AIMPLB)، اور دیگر معتبر مذہبی شخصیات کی خاموشی کا ذکر وہ بہت تلخی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اقتدار کے مراکز تک رسائی رکھنے کے باوجود، یہ رہنما ایمرجنسی کے غیر جمہوری اقدامات کے خلاف آواز اٹھانے میں ناکام رہے، جس سے قیادت کا خلا پیدا ہو گیا۔ اس خاموشی کے مقابلے میں عوامی سطح پر ہونے والی کوششیں نمایاں ہیں، جن میں ان کے گھرانے نے نئے مکاتب کی تشکیل اور اسکول کے بعد کتابیں فروخت کرنے جیسی نئی حکمتِ عملیاں اپنائیں تاکہ کسی حد تک معاشی تنگی سے نجات مل سکے۔

ترکمان گیٹ کا واقعہ، ایک گہرا اور تاریخی زخم ہے، جہاں بھارتی مسلمانوں کو زبردستی نکالا گیا۔ شاز اس کی خونریزی اور المناک فرقہ وارانہ واقعات کو کرب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ریاستی سطح پر مسلمانوں کے خلاف ہونے والے اس تشدد کو مرادآباد میں عید کی نماز کے دوران فائرنگ اور ہاشم پورہ قتلِ عام جیسے واقعات نے مزید گہرا کر دیا۔ ان مظالم نے ایک ایسی اجتماعی شناخت تشکیل دی جو محاصرے، نقصان اور بے پناہ مشکلات کے خلاف بقا کی جدوجہد سے جڑی ہوئی تھی۔

بین الاقوامی سطح پر راشد شاز ایرانی انقلاب کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں، خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں میں شیعہ طلبا پر اس کے اثرات۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ انقلاب صرف شیعوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے سنی طلبا اور مفکرین کو بھی متاثر کیا، اقبال اور سید قطب جیسے مفکرین کے نظریات سے فکری ربط قائم کیا۔ ایران اور سعودی عرب کے درمیان اسلامی قیادت کی جدوجہد بھی ایک وسیع تر مسلم دنیا کے تنازعے کی عکاسی کرتی ہے، جسے بھارتی مسلمان امید اور احتیاط دونوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ شاز اس بات پر بھی بحث کرتے ہیں کہ علی شریعتی کو ایک بڑے نظریاتی رہنما کے طور پر سرکاری سطح پر کیوں تسلیم نہیں کیا گیا۔

راشد شاز بھارت کے اندر مسلمان قیادت کی تنقید سے بھی نہیں چوکتے، جنہیں وہ اکثر 'گھر کے غلام' (house negroes) کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک ایسا لفظ جو اشتراکیت اور غلامی کے تجربے سے لیا گیا ہے اور جس میں فرمانبرداری اور اشتراک کی تلخی چھپی ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک یہ رہنما اکثر معمولی مراعات حاصل کرنے کے بدلے پورے معاشرے کے مفاد کو نظرانداز کرتے ہیں، اور وزرائے اعظم سے ملاقاتیں کر کے علامتی وفاداری کا اظہار تو کرتے ہیں، لیکن اپنے اثر و رسوخ کو مسلمانوں کے حقیقی تحفظ یا ترقی میں تبدیل نہیں کر پاتے۔ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی جگہ مزید تنگ ہوتی چلی جاتی ہے، اور علی گڑھ جیسی تاریخی جگہوں سے اردو شعرا اور مفکرین کا تدریجاً بے دخل ہونا اسی تنزلی کی علامت ہے۔

تعلیمی اداروں، خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (AMU) میں، مسلمان محققین اور طلبا کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگیوں کو اجاگر کرتے ہوئے راشد شاز کہتے ہیں کہ انہیں

اپنی سیاسی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اپنی مسلمانی کے کچھ پہلوؤں کوکم کرنے یا چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ دباؤ اس وسیع تر معاشرتی تقاضے کی عکاسی کرتا ہے جو بھارتی مسلمانوں سے مسلسل اپنی شناخت کو سمجھنے، ڈھالنے اور باتوں باتوں میں مانگنے پر مجبور کرتا ہے، جبکہ وہ کبھی بھی غالب قومیت کے اندر مکمل طور پر خود کو پُرسکون محسوس نہیں کرتے۔ 'قوم پرست مسلمان' کا تصور خود ایک پیچیدہ اور دباؤ بھرا تصور بن جاتا ہے، جس میں مسلمانوں سے پاکستان کے خلاف عوامی طور پر بیزاری کا اظہار اور اپنے حقیقی حقوق کے مطالبے کو دبا کر ہندوستانی وفاداری ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔

کتاب کے مصنف آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت (AIMMM) پر بھی تنقید کرتے ہیں، جس کا سیاسی ردعمل بھی حکومت کی منظوری پر انحصار کرتا ہے۔ اکثر اس وقت دیکھا گیا ہے جب مسلمانوں کے خلاف خوں ریز تشدد پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ آسام میں نیلی قتلِ عام ایک ایسا ہی دردناک واقعہ ہے۔

اپنی سرگرمیوں کے تناظر میں اپنی ذاتی قربانیوں کا ذکر کرتے ہیں، جن میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر سے محرومی بھی شامل ہے۔ اس محرومی کا شکار وہ اس لیے ہوئے کہ انہوں نے قیادت اور ریاستی پالیسیوں پر کھلی تنقید کی تھی۔ بعد ازاں جب وہ AMU میں برج کورس کے ڈائریکٹر اور پروفیسر کے عہدے پر مقرر ہوئے تو پروفیسر اعجاز حبیب اور ان کے گروہ نے ان کے خلاف مزاحمت کی۔ جے این یو کے بائیں بازو کے ساتھیوں کی طرح وہ مسلمانوں سے اپنی مسلمانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے کمیونزم میں اپنی وفاداری ثابت کرنے پر زور دیتے ہیں۔

پاکستان کے اسفار اور گلبدین حکمت یار جیسی شخصیات سے ملاقاتیں ان کے تجربے کو علاقائی سطح پر وسیع کرتی ہیں۔ افغان جہاد، جو امریکہ کی جانب سے کیے گئے جیو پولیٹیکل کھیل کا حصہ تھا، اس کے نتائج مسلم یکجہتی اور مسلم آباد علاقوں دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔

مصنف کے بیان کا مرکزی نقطہ یہ نفسیاتی محاصرہ ہے جسے بھارتی مسلمان صرف اعداد و شمار کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک مستقل اقلیتی ذہنیت کی وجہ سے جھیل رہے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں بے بسی اور بے گانگی کے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بھارتی تجربے کو اسپین کے ساتھ منسلک کرتے ہیں، جہاں مسلمانوں کی عمارتیں زوال کے بعد باوجود سیاسی اقتدار کے بھی باقی رہیں۔ بابری مسجد کا واقعہ، جو جدید بھارت میں فرقہ وارانہ تصادم کا سب سے واضح نمونہ ہے، بہت گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔ راشد شاز ہندوستان میں کمیٹی کی سیاست، ہندوؤں کی دھمکی آمیز زبان اور مسلمانوں کے ردِعمل کی دیر سے آنے والی نوعیت کا تجزیہ کرتے ہیں، جس نے مسلمانوں کو حملے اور وسیع پیمانے پر تشدد، جیسے مرادآباد اور ہاشم پورہ میں ہونے والے واقعات، کے لیے ناقابلِ دفاع بنا دیا۔

بھاگلپور فسادات اور بہار میں مسلمانوں کی نقل مکانی ان بار بار ہونے والے المیوں کی عکاسی کرتے ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعی یاد میں گہرے نشان چھوڑتے ہیں۔ ان کی تنقید علی میاں جیسے مسلمان رہنماؤں پر بھی ہے، جن کے پاس وزرائے اعظم تک رسائی تھی لیکن وہ فرقہ وارانہ مظالم کے دوران مسلمانوں کی حفاظت نہ کر سکے۔

آخر میں سوانح عمری بہاری مسلمانوں کی مسلسل مشکلات پر روشنی ڈالتی ہے، جو مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے دوران اور اس کے بعد سے اب تک متاثر ہیں۔ بہاری مسلمان مسلسل مشکلات اور نقل مکانی کے دباؤ میں رہتے ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل صرف بھارت تک محدود نہیں بلکہ خطے کے باہر بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تاثرات بے وطنی، شناخت کے بحران، مضبوطی اور انصاف کی تلاش جیسے وہی موضوعات دہراتے ہیں جو پوری کتاب میں گونجتے رہتے ہیں۔

راشد شاز کی سوانح عمری ایک انتہائی ذاتی لیکن ساتھ ہی وسیع تاریخی تناظر میں ایک سیاسی سفر ہے، جو ایک صدی کی تبدیلیوں سے گزرتی ہے اور سرخیوں اور اعداد و شمار کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقی زندگیوں کو روشن کرتی ہے۔ یہ قاری کو معمولی بیانیوں پر نظر ثانی کرنے اور ہندوستان اور جنوبی ایشیا میں فرقہ واریت، قیادت، اور شناخت کی سیاست کے بارے میں نامطلوب حقائق کو سامنے لانے پر مجبور کرتی ہے۔ 'لا یموت'

ایک اہم گواہی ہے اور ایک پکار ہے، ایک ایسا کام جو بھارتی مسلمانوں کی مشکلات اور ان کی مضبوطی کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے مستقبل کی خواہش کرتی ہے جہاں مسلمانوں کی آوازیں دبانے کے بجائے بلند کی جائیں۔ یہ سوانح عمری برسوں تک ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی، تاریخ اور سیاست کی پیچیدہ کارپٹ کو سمجھنے کے لیے ایک اہم حوالہ بنی رہے گی۔ ملک کی نازک وسنگین صورت حال میں اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ (Index) کی شمولیت سے کتاب کی حوالہ جاتی اہمیت مؤثق ہوگئی ہے۔

☆ مبصر سے رابطہ: مشتاق الحق احمد سکندر، سرینگر (کشمیر)
Email: sikandarmushtaq@gmail.com

□□□

یہ نصف صدی کا قصہ ہے

(خودنوشت، صحافت کے پچاس سال)

مصنف: عارف عزیز

مرتب: ڈاکٹر مرضیہ عارف

تبصرہ: سہیل انجم☆

ادیبوں، شاعروں، سیاست دانوں کی مانند صحافی حضرات بھی خودنوشت لکھتے اور اپنے ذاتی حالات وتجربات اور اخبارات کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ اسی کڑی میں بزرگ صحافی اور روزنامہ 'ندیم' بھوپال کے ایڈیٹر عارف عزیز کی خودنوشت منظرعام پر آئی ہے جسے صحافتی وعلمی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ 2024 میں انہوں نے راقم الحروف کو بذریعہ فون اطلاع دی تھی کہ وہ اپنی خودنوشت لکھنے جا رہے ہیں۔ ان کی یہ بات سن کر بے انتہا مسرت ہوئی تھی کہ اس کے

صفحات: 448 قیمت:-/1000 اشاعت:2025
ISBN 978-93-344-0038-0
ناشر: عزیز پبلی کیشنز، 20 گھاٹی بھربھونجا روڈ، تلیّا،
بھوپال-462001 (ایم پی) ۔موبائل:9425673760

مطالعے سے نہ صرف ان کے بارے میں بلکہ پانچ دہائیوں کی اردو صحافت کے سلسلے میں بھی گراں قدر معلومات حاصل ہوں گی اور ہم جیسے صحافیوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ انہوں نے خودنوشت تحریر کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو کہ روزنامہ ندیم میں قسطوار شائع ہونے لگا۔ اس طرح 2025 میں یہ سفرنامہ مکمل ہوا اور کتابی صورت میں شائع ہوکر اہل نظر کی خدمت میں پہنچ گیا۔

جیسا کہ اس کتاب کا نام ہے اس میں نصف صدی کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ اس خودنوشت میں عارف عزیز کی ابتدائی زندگی سے لے کر اب تک کی زندگی کی جھلک بھی ہے اور صحافت میں ان کے داخلے اور ان کے صحافتی تجربات کا بیان بھی ہے۔ یہ صرف ایک خودنوشت نہیں بلکہ پانچ دہائیوں کی صحافت، سیاست اور معاشرت کی تاریخ ہے۔ عارف عزیز پانچ دہائیوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں ان کا یومیہ سیاسی کالم پانچ دہائیوں سے شائع ہو رہا ہے، یہ کالم کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ نہ تو ان کے اسفار نے کالم تحریر کرنے سے انہیں روکا اور نہ ہی صحت کے مسائل نے اور نہ ہی گھریلو مصروفیات نے۔ یہ کالم صرف بھوپال کے اخباروں میں نہیں بلکہ ملک کے دیگر اردو اخبارات میں بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ کالم تحریر کرنے یا اس کی اشاعت میں کبھی بھی کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ عارف عزیز تمام قسم کی رکاوٹوں کو عبور کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کے کالموں کے خلاف بھوپال میں احتجاج بھی ہوا اور ان پر الزامات بھی عاید کیے گئے۔ لیکن احتجاجوں اور الزامات نے ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کی۔ میں نے بہت پہلے ان پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیا تھا جس کا عنوان میں نے 'عہد حاضر کے فارقلیط' باندھا تھا۔ جس طرح (مولانا) محمد عثمان فارقلیط ابتدائی عمر سے ہی صحافت میں آگئے تھے اور نصف صدی سے زائد عرصے تک اسی کوچے میں رہے اور نہ صرف اردو صحافت کی خدمت کرتے رہے بلکہ مسلمانوں کی فکری رہنمائی بھی انجام دی۔ اسی طرح عارف عزیز نصف صدی سے بے روک ٹوک اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بھی صحافت کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملت کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

عارف عزیز نے 'میری پہلی تحریر جو شائع نہ ہوسکی' کے زیر عنوان اپنی پہلی رپورٹ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی طالب علمی کے زمانے میں بھوپال میں ایک مسلکی مناظرہ ہوا تھا جس کی روداد انہوں نے تیار کی۔ اسے دیکھ کر مدرسے کے ان کے سینئر استاد اور مناظرے کے مشاہد علامہ سید عابد علی وجدی الحسینی نے نہ صرف اس روداد کی تعریف کی بلکہ کہا کہ آپ کو اخبار کا نامہ نگار ہونا چاہیے۔ ایسی جامع رپورٹ ایک صحافی ہی لکھ سکتا ہے۔ ان کی زبان سے نکلنے والا یہ جملہ عارف عزیز کی آئندہ کی زندگی کا بلکہ پوری زندگی کا عنوان بن گیا اور انہوں نے صحافت کی تاریخ میں اپنا نام رقم کروا لیا۔ انہوں نے اگلے صفحات میں سابقہ جَن سنگھ پارٹی اور موجودہ بی جے پی کے رہنما عارف بیگ کے اخبار 'ایاز' کا ذکر کیا ہے جو کہ سیاسی چشمک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ ایاز نے آزادی کے پچیس سال مکمل ہونے پر ایک خصوصی شمارہ نکالنے کا اعلان کیا تو انہوں نے سید عارف علی نام سے، جو کہ ان کا اصلی نام ہے، 'آزادی کے پچیس سال: کیا کھویا کیا پایا' کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جو ایاز میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ سلامت علی مہدی کے ڈائجسٹ 'محراب' سمیت متعدد اخبارات و رسائل نے اسے نقل بھی کیا۔ بعد میں جب ان کے دوست اشفاق مشہدی اس کے ایڈیٹر ہو گئے تو وہ اس اخبار میں کام کرنے لگے۔ بعد میں وہ آفتاب جدید میں چلے گئے۔

آفتاب جدید بند ہونے کے بعد وہ روزنامہ افکار، بھوپال ٹائمز اور پھر اس کے بعد روزنامہ ندیم میں چلے گئے۔ اس وقت وہ ندیم کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے ندیم کی اہمیت کا بچپن سے اندازہ تھا۔ کیونکہ شعور نے جب آنکھیں کھولیں تو اردو کے اخباروں میں پہلا نام ندیم کا سنا جو میری پیدائش سے سات سال پہلے نکلنے لگا تھا۔ 1935 میں محمود الحسن صدیقی نے اسے غیر سرکاری اخبار کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ 1938 میں روز نامہ اور نیم سرکاری اخبار ہو گیا جس کے لیے وسائل نوابی حکومت فراہم کرتی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد حکیم سید قمر الحسن اس کے مدیر اعلیٰ بنے اور زندگی کی آخری سانس تک یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ جب ہی سے ندیم کا شمار برصغیر کے اہم اخباروں میں ہونے لگا تھا۔ سرسید کے پوتے سر راس مسعود نے جو بھوپال ریاست کے وزیر تعلیم تھے، اس کی سرپرستی فرمائی اور اخبار کے لیے جملہ وسائل، ایڈیٹوریل اسٹاف، بڑا عملہ اور شاندار عمارت فراہم کرائی۔ رائٹر اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات بھی اسے حاصل رہیں۔ ندیم کے ادارتی شعبہ سے اپنے زمانہ کے ممتاز صحافی وابستہ رہے اور بیشتر کی تربیت حکیم قمر الحسن صاحب نے کی۔ خاص طور پر (مولانا) محمد مسلم جو بعد میں دعوت دہلی کے ایڈیٹر بنے، اے آر رشدی اور اشتیاق عارف جنہوں نے بعد میں اپنا روزنامہ افکار نکالا، حسن الزماں اختر جو پاکستان چلے گئے تو وہاں کے ممتاز صحافیوں میں شمار ہوئے۔ محمود الحسینی جنہوں نے ندیم کے بعد روزنامہ الحمراء نکالا، قمر اشفاق جو 50 سال تک ندیم کو ایڈٹ کرتے رہے، طالب قریشی جنہوں نے نامہ نگار کی حیثیت سے اپنی خاص شناخت بنائی، حامد حسن شاہ، مقصود اصغر، انعام لودھی، جو ندیم میں مختلف صحافتی خدمات انجام دیتے رہے، راقم (عارف عزیز) جس کا یومیہ کالم 1988 سے آج تک اس اخبار میں شائع ہو رہا ہے اور جو دیگر اخبارات میں نقل کیا جاتا ہے، جہاں قدر چغتائی، نسیم انصاری اور پروفیسر ضمیر الدین جو برسوں اخبار کا طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھتے رہے، یہ سب ندیم کے پروڈکٹ ہیں ... ندیم نے اپنے اس دور میں جب سرکاری اعانت پر اس کا انحصار تھا کبھی عوام کے جائز مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے حکیم قمر الحسن صاحب کی قیادت میں حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کی ایک کڑی کے طور پر کام کیا اور دیانت و صداقت کے ساتھ اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ اس دور میں ندیم کے کئی تاریخی نمبر سہ رنگی تصاویر کے ساتھ منظر عام پر آتے رہے۔ مقامی شعرا، ادبا اور فنکاروں کے علاوہ ہندوستان کے چوٹی کے شاعر، ادیب اور عالم اس کے کالموں میں چھپتے تھے۔''

کتاب میں ایمرجنسی کا بھی ذکر ہے اور اس دوران عوامی خوف و دہشت کا بیان بھی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ذاتی تجربات بھی بیان کیے ہیں۔ عارف عزیز نے لکھا ہے کہ ایمرجنسی کے اعلان کے پہلے دن حکومت مخالف کئی اخبارات شائع نہیں ہوئے۔ بہت سے روزناموں نے بطور احتجاج ایڈیٹوریل کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ دہلی کے اخباروں پر ایمرجنسی کا اثر زیادہ

رہا۔ اس حوالے سے اخبارات پر نافذ سنسر شپ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ انہوں نے اندرا گاندھی کے قتل کی خبر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ 'آفتاب جدید' میں یہ خبر آئی کہ اندرا گاندھی نے خودکشی کر لی ہے۔ بعد میں اس کی اصلاح ہوئی کہ نہیں انہیں ان کے محافظوں نے قتل کر دیا ہے۔ بھوپال میں پیش آنے والا گیس المیہ ہندوستان کے بعض المناک حادثات میں سے ایک ہے۔ یہ حادثہ 2 اور 3 دسمبر 1984 کی درمیانی شب میں پیش آیا تھا جس میں ہزاروں انسان آن واحد میں لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ انہوں نے بابری مسجد کے انہدام کے بعد بھوپال کی کشیدہ صورت حال کے بعد رونما ہونے والے فسادات کے ذکر کے ساتھ وہاں کے روایتی ہندو مسلم اتحاد کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

انہوں نے رمضان المبارک میں مسلم علاقوں کے ماحول میں آنے والی تبدیلیوں کے ذکر کے ساتھ لکھا ہے کہ ستر اسی سال کے درمیان ماحول اور طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ عارف عزیز حافظ قرآن بھی ہیں۔ انہوں نے قرآن کو اس طرح حفظ کیا کہ دن میں حفظ کرتے اور رات میں تراویح میں سناتے۔ اس طرح انہوں نے 61 سال تک مساجد میں قرآن سنایا۔ لیکن جسمانی ضعف کی وجہ سے 2017 کے بعد سے گھر میں پڑھنے لگے ہیں۔ انہوں نے اردو زبان اور صحافت کا بھی خاصا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق سچائی یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کا ارتقا رک گیا ہے۔ نئی نسل سے اس زبان کا رشتہ تیزی سے منقطع ہو رہا ہے۔ اردو شاعری ماضی کے خمار کے درجہ پر پہنچ گئی ہے اور کوئی بھی خمار زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتا۔ ہر عوامی زبان کے لیے لازم ہے کہ اس سے عام لوگوں کے پڑھنے لکھنے کا تعلق برقرار رہے۔ زبان اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک روزی روٹی سے اس کا تعلق استوار ہو۔

انہوں نے اردو صحافت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ کمپیوٹر کی آمد نے اردو اخبارات کی راہ کو کافی آسان کر دیا ہے۔ اب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ خبریں اور مضامین تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اردو صحافیوں کی تربیت کی ضرورت پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ غیر تربیت یافتہ عملہ اردو صحافت کی بڑی کمزوری بن گیا ہے۔ اکثر نوجوان پروف ریڈر کی حیثیت سے اردو اخبارات میں قدم رکھتے ہیں اور بغیر تربیت و تجربہ کے سب ایڈیٹر یا نامہ نگار بن جاتے ہیں۔ یہ خودرو ہوتے ہیں لہٰذا تربیت نہ ہونے سے اخبار کا معیار متاثر ہوتا ہے۔ انہوں نے اخبارات میں زبان کی غلطیوں پر اظہار تاسف کیا ہے۔ اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ''صحافت میرے لیے پیشہ ہی نہیں شوق بھی ہے۔ اتنے تجربات و مشاہدات اور تاثرات میرے ذہن میں محفوظ ہیں کہ مزید ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔'' ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایک بار پھر کمر ہمت کسیں گے اور اپنے صحافتی تجربات و مشاہدات کو قلم بند کریں گے تاکہ اردو صحافت کی آنے والی نسلیں کچھ سیکھ سکیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب محض خودنوشت نہیں بلکہ واقعی نصف صدی کا قصہ ہے۔ اسے ہر اردو داں کو اور بالخصوص اردو صحافیوں کو تو ضرور پڑھنا چاہیے۔ بس کتاب کے مطالعے کے دوران ایک چیز بار بار کھٹکتی رہی کہ انہوں نے کتاب میں کوئی باب نہیں بنایا۔ ایسا لگتا ہے جیسے قلم برداشتہ لکھتے چلے گئے ہیں البتہ درمیان میں ضمنی سرخیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ انہوں نے جن اخباروں میں خدمات انجام دیں اگر ان کے اور سیاسی تفصیلات کے الگ الگ باب بنائے ہوتے تو کتاب اور دلچسپ ہو جاتی۔ لیکن وہ ایسا شاید اس لیے نہیں کر پائے کہ تمام واقعات زمانی اعتبار سے درج کیے گئے ہیں۔ جو واقعہ جس وقت رونما ہوا اسی موقع پر اسے لکھ دیا گیا۔ لیکن بہرحال اگر ابواب بندی کی گئی ہوتی تو تحریر کا سپاٹ پن ختم ہو گیا ہوتا۔ اس بات کو لکھنے کا حوصلہ اس وجہ سے ہوا کہ عارف عزیز صاحب نے خود راقم الحروف سے کہا تھا کہ اس کی خامیوں کی نشاندہی ضرور کرنا۔

☆ مبصر کا پتہ: 370/6A، ذاکر نگر، نئی دہلی-110025

Mobile: 9818195929

❑❑❑

اردو کی حقیقی ترقی ہی
اردو کی معراج ہے

یہ میں ہوں: سیرۃ الذّاتیہ
(خودنوشت سوانح)
مصنف: ف۔س۔اعجاز

تبصرہ: پروفیسر محمد سلیم قدوائی٭

ف س اعجاز ادبی اور صحافتی دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ زیرتبصرہ کتاب ان کی خودنوشت ہے جو چند سوانحی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں 'مصنف ایک نظر میں' (کوائف) جامع اجمالی تعارف ہے جس سے مصنف کی پوری زندگی اختصار کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ خاندانی حالات کے مختصر بیان سے شروع ہوکر یہ کتاب ان کی زندگی کے تفصیلی حالات پیش کرتی ہے۔ جو ہنر ان کو خاندانی ورثہ میں ملا تھا۔ انہوں نے پہلے طباعت کا کام شروع کیا پھر فیکٹری لگائی اور مختلف چیزیں بنانے کا کام شروع کیا۔ کاروبار کے ساتھ ساتھ ادب وصحافت کے میدان میں بھی سرگرم رہے۔ سب سے پہلا اردو ڈائجسٹ فانوس کے نام سے انہوں نے کلکتہ سے 1965 میں نکالا جو چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ پھر وہ فلمی صحافت کی طرف مائل ہوئے اور مضامین اور انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں وہ فلمی ہفت روزہ عکاس کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد انہوں نے انشا کے نام سے رسالہ نکالنا شروع کیا جو کلکتہ کا پہلا رسالہ ہے جو گزشتہ چار دہائیوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ پہلے یہ ماہانہ تھا لیکن 1991 سے دوماہی کر دیا گیا۔ اس رسالے کے متعدد خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جن کی اہمیت اور خصوصیت کی بنا پر ان کو ہندوستان کا محمد طفیل یعنی مدیر نقوش کا ثانی بھی کہا گیا۔ اس کے علاوہ وہ 32 کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ احمد عباس اور قمر رئیس کی شخصیتوں نے ان کو خاص طور سے متاثر کیا۔ اس کا اندازہ کتاب کے فلیپ سے لگایا جاسکتا جو خواجہ احمد عباس کی یاد میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عباس صاحب کی تنوع پسندی کی ایک کرن میرے من میں چپکے سے داخل ہوگئی ہے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف خواجہ احمد عباس کی طرح ادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مبصر، نقاد، فلم اور کلچر کا ناقد اور فیچر نگار بھی بن گئے۔ خواجہ احمد عباس کے علاوہ قمر رئیس سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے۔ قمر رئیس سے اپنی رفاقت کا ذکر اور ان سے وابستہ یادیں تفصیل کے ساتھ 'قمر رئیس اور میں' میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مضمون غیر مربوط یادوں اور قمر رئیس کے چند خطوط پر مشتمل ہے۔ انہوں نے قمر رئیس کو دوست، فلاسفر اور گائڈ قرار دیا ہے جنہوں نے قدم قدم پر رہنمائی کی اور رسالے کے سلسلے میں عملی تعاون کیا۔

اس کتاب میں ان کے استاد عبدالعلی فغاں کا خاکہ بھی شامل ہے جنہوں نے ان کو کالج میں اردو پڑھائی تھی۔ مصنف کو قلم کار بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ موجودہ دور میں جب اکثر لوگ اساتذہ کو یاد نہیں کرتے، استاد کو خراج عقیدت پیش کرنا بڑی بات ہے۔

کتاب کا آخری باب 'یادیں خطوں کی' نہایت دلچسپ ہے۔ ان کے مطابق خطوط ٹانک کا کام کرتے تھے۔ ان سے فکر کی روشنی اور جذباتی توانائی حاصل ہوتی تھی۔ خطوں میں محبت اور خلوص کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ آج کے ڈیجیٹل دور نے ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوط کی روایت کو تقریباً ختم کر دیا ہے جو بلا شبہ ایک تہذیب کا خاتمہ ہے۔ کتاب میں کل مضامین کی تعداد 25 ہے۔ مضامین کے ساتھ ساتھ چند نظمیں اور ایک تقریر بھی شامل ہے۔ آخر میں ضمیمے کے طور پر ایک مزاحیہ 'ف س اعجاز کا معاشقہ' اور ماہنامہ انشا کے خاص نمبروں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے انکساری سے کام لیتے ہوئے اس کتاب کو معمولی آدمی کی سرگزشت قرار دیا ہے لیکن اس خودنوشت کا مطالعہ کرنے سے مصنف کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کے مختلف صفحات پر متعدد تصاویر بکھری نظر آتی ہیں لیکن آج کے ڈیجیٹل دور کے لحاظ سے انتہائی ناقص ہیں۔ بعض

صفحات: 264 قیمت:-/600 اشاعت:2025
ISBN 978-81-88346-88-4
ناشر: انشا پبلی کیشنز، B-25 زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-73
Mobile: 9830483810

تصاویر تو اتنی دھندلی ہیں کہ شکلیں شناخت کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ نتیجے کے طور پر کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش اسے تفصیل سے لکھا جاتا۔ بہرحال یہ کتاب خودنوشت کے شعبے میں ایک خوش گوار اضافہ کہی جاسکتی ہے اور سوانح سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے یہ کتاب یقیناً دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے۔طباعت عمدہ ہے۔

☆ مبصر کا پتہ:C-501،روزوڈس اپارٹمنٹ،میورو ہارا،نئ دہلی-91
E-mail: mskidwai@hotmail.com
Mobile: 9953529424

❑❑❑

دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات

مصنف: **پروفیسر مجید بیدار** (حیدرآباد)
Mobile: 9441697072

تبصرہ: ڈاکٹر شاہد حبیب☆

اردو زبان کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور بنیاد ساز باب 'دکنی ادب' ہے۔اس حیثیت سے اُس دور اور علاقے کو امتیاز حاصل ہے کہ اردو زبان نے اپنے اولین ادبی نقوش یہیں ثبت کیے اور ایک منفرد اسلوب و لہجے کو اپنایا۔ ہندوستان کے لسانی، ثقافتی اور تہذیبی تنوع کی ایک جیتی جاگتی تصویر کی طرح دکنی ادب کو دیکھا جاتا ہے۔ دکنی زبان کا مطالعہ کیے بغیر اردو کی تاریخ کا تصور ادھورا رہتا ہے۔تاہم، حقیقت یہ ہے کہ دکنی ادب پر لکھی گئی اکثر کتابیں یا تو محض متنی تنقید تک محدود ہیں یا پھر کسی خاص صنف یا دور کے گرد گھومتی ہیں۔ ایک جامع، مربوط اور تدریسی تقاضوں کو پورا کرنے والی کتاب کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اس پس منظر میں پروفیسر مجید بیدار

صفحات: 704 قیمت:-/600 اشاعت:2021
ISBN 978-93-85258-74-9
زیر اہتمام: تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی۔
Mobile: 9811612373

(پ:16 مئی 1952) کی زیر نظر تصنیف 'دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات' ایک خوشگوار اضافہ ہے، جو اس خلا کو پر کرنے کی کامیاب اور سنجیدہ کوشش ہے۔ یہ ضخیم تصنیف نہ صرف ایک محقق کی برسوں کی محنت کا حاصل ہے بلکہ تاریخی، لسانی، ادبی اور تدریسی پہلوؤں سے بھی قابل قدر ہے۔

پروفیسر مجید بیدار، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ایک لمبی مدت تک وابستہ رہ کر جون 2012 میں سبکدوش ہوئے۔ اردو دنیا میں وہ ایک ایسے محقق، نقاد اور مدوّن کے طور پر جانے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی علمی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکنی زبان و ادب کی تحقیق، تدریس اور ترویج کے لیے وقف کیا ہے۔ وہ نہ صرف دکن کی لسانی و ادبی تاریخ کا معتبر حوالہ ہیں بلکہ جنوبی ہند کے مخطوطاتی ذخائر کی بازیافت اور ان کے سائنسی مطالعے میں بھی نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ چار دہائیوں پر محیط تدریسی تجربے نے ان کے علمی کام کو ایک ایسا تدریسی اور تحقیقی توازن عطا کیا ہے جو کم ہی اہلِ قلم کو نصیب ہوتا ہے۔'دکنی تذکرے' (مطبوعہ:1985)، 'دکنی نثر پر ایک نظر' (مطبوعہ: 2007)، 'دکنی زبان و ادب کی تفہیم' (مطبوعہ:2019)، جیسی ان کی متعدد تصانیف اور تحقیقی مقالات میں دکنی ادب کے ابتدائی نقوش، اس کے شعرا و ادبا کی تخلیقی جہات اور لسانی ارتقا کے مختلف پہلوؤں پر گہری بصیرت جھلکتی ہے۔ انہوں نے نایاب مخطوطات کی تدوین، متون کی صحت یابی اور تاریخی ولسانی تناظر میں ان کی تشریح کے ذریعے دکنی ادب کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اسے معاصر علمی مباحث میں مرکزی مقام دلایا۔ان کی تحقیقی محنت، حوالہ جاتی استناد اور بیانیہ کی روانی انہیں اردو تحقیق کے معتبر ترین ناموں میں شامل کرتی ہے۔ پروفیسر مجید بیدار کے چالیس سالہ تدریسی تجربے نے اس کتاب کی ساخت اور مواد کو ایک واضح سمت دی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ یہ کتاب صرف محققین کے لیے نہیں بلکہ اساتذہ، طلبا اور عام قارئین کے لیے بھی یکساں مفید ہو۔ اسی لیے انہوں نے اس میں خود تدریسی مواد (Self-Instructional Material) کی تکنیک اپنائی، تاکہ قاری نہ صرف مواد کو سمجھے بلکہ اسے آسانی سے یاد بھی رکھ سکے۔

زیرنظر تصنیف 'دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات' چالیس مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون دکنی ادب کے کسی نہ کسی اہم پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے مصنف نے 'دکنی زبان کا تعارف اور اس کے جغرافیائی حدود' بیان کیے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ دکنی اردو کی ابتدا تیرہویں صدی کے اوائل میں جنوبی ہند میں ہوئی، جہاں یہ مختلف بولیوں اور لسانی اثرات کے امتزاج سے وجود میں آئی۔ اس کے بولنے والے علاقے دکن کی وسیع سلطنتوں — بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور برہمنی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لسانی ڈھانچے میں مقامی دکن کی بولیوں کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ و تراکیب نے بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس تعارفی حصے کے بعد وہ دکن کے ابتدائی شعری و نثری نقوش پر روشنی ڈالتے ہیں اور دکنی کے اولین شعرا اور مصنّفین کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار کی ادبی فضا پر الگ الگ مضامین میں سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ بہمنی دور میں فارسی کی سرکاری سرپرستی کے باوجود دکنی کو عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی، جبکہ عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار میں یہ زبان درباری شعر و ادب کا اہم ذریعہ بنی۔ مثنوی، غزل، قصیدہ اور مرثیہ جیسی اصناف نے درباری سرپرستی میں ترقی پائی اور نثر نگاری نے بھی خاطر خواہ پیش رفت کی۔ مصنف ان ادوار کے شعری و نثری نمونوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دکنی ادب کس طرح دربار، عوام اور صوفی خانقاہوں میں یکساں فروغ پا رہا تھا۔ مثنوی کے حوالے سے ملا وجہی، نصرتی اور ہاشمی بیجاپوری جیسے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، جبکہ غزل میں محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد دکنی شعر و ادب میں صوفیائے کرام کے کردار کو بیان کیا گیا ہے، جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ دکنی ادب کی فکری بنیادوں میں تصوف کی گہری آمیزش ہے۔ خانقاہوں اور صوفی حلقوں میں دکنی زبان کو وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا گیا، تاکہ عام عوام بھی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو اپنی زبان میں سمجھ سکیں۔ اسی سلسلے میں مصنف نے نایاب مثنویات کا تعارف بھی پیش کیا ہے، جن میں حضرت سید یوسف شاہ راجو قتال حسینی کی 'سہاگن نامہ' اور حضرت زین الدین داؤد شیرازی کی 'نرلک نامہ' شامل ہیں۔

زیرنظر کتاب کی نمایاں خصوصیات میں سب سے پہلی بات اس کا جامع زمانی تسلسل ہے، جو اسے دیگر دکنی ادب پر لکھی گئی کتب سے ممتاز بناتا ہے، جس میں تیرہویں صدی میں ہوئی دکنی ادب کی ابتدا، اس کے ارتقاء اور زوال تک کے تمام ادوار کو ایک مربوط تاریخی ربط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی 'تدریسی ساخت' بھی قابلِ ذکر ہے، کیونکہ ہر مضمون کے اختتام پر 'اشارات'، 'خلاصہ' اور 'سفارش کردہ کتب' کی فہرست فراہم کی گئی ہے، جو تدریس کے عمل کو آسان بنانے کے ساتھ ساتھ طلبا اور محققین کے لیے امتحانی تیاری اور ریفرنس کے طور پر بھی نہایت مفید ہیں۔ اسی کے ساتھ لسانی و ادبی امتزاج کو بھی نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے، جس سے ادبی متون کا تجزیہ، لسانیاتی خصوصیات، تاریخی پس منظر اور ادبی میلانات، سبھی کچھ ایک وحدت میں ضم ہو گیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتاب میں تحقیقی نوادرات کی شمولیت نے اسے غیر معمولی علمی اہمیت عطا کی ہے۔ نایاب مثنویات، کم معروف شعرا کی تخلیقات اور مخطوطات کی بازیافت کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ نہ صرف دکنی ادب کی ادبی تاریخ میں ایک قیمتی اضافہ ہیں بلکہ آئندہ کے محققین کے لیے نئے تحقیقی امکانات بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کتاب میں تحقیق کی گہرائی اور حوالہ جاتی استناد نمایاں ہے۔ مصنف نے بیدر، گلبرگہ، خلدآباد اور اورنگ آباد کے کتب خانوں اور ذاتی مجموعوں سے نایاب مخطوطات کا مطالعہ کیا۔ کئی ایسی تخلیقات کا ذکر کیا جو عام قاری یا محقق کی دسترس سے باہر تھیں۔ مصنف کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے دکنی ادب کی تاریخ میں متنازعہ نظریات پر بھی سنجیدہ بحث کی۔ مثلاً دکنی کو ہندی کا ابتدائی روپ قرار دینے کی رائے کو وہ دلائل کے ساتھ رد کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ دکنی چونکہ اردو رسم الخط میں لکھی گئی اور اس کی لسانی ساخت اردو سے ہم آہنگ ہے، اس لیے یہ اردو کی ہی ایک ابتدائی اور علاقائی شکل ہے۔

پروفیسر مجید بیدار کا اسلوب سنجیدہ مگر رواں ہے۔ انہوں نے

مشکل اصطلاحات کو مثالوں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ واضح کیا ہے۔ تحقیقی مواد کے باوجود ان کی نثر میں روانی اور دلکشی ہے۔

کتاب پڑھ کر یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ دکنی محض اردو کی ابتدائی شکل نہیں بلکہ ایک خودمختار اور بھرپور ادبی روایت کی حامل ہے، جس نے اردو زبان و ادب کی تشکیل میں گہرے اثرات ڈالے۔ اس تصنیف کے ذریعے پروفیسر مجید بیدار نے نہ صرف اس روایت کو محفوظ کیا بلکہ اسے نئے تحقیقی زاویوں کے ساتھ پیش کر کے آئندہ نسلوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ مہیا کیا ہے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی سطح کے طلبا کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، خصوصاً دکنی ادب سے متعلق پرچوں کی تیاری میں۔ خود تدریسی انداز کی وجہ سے اساتذہ اس سے لیکچر نوٹس آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔ کتاب کا مواد اگرچہ سنجیدہ ہے، لیکن ادب اور زبان سے دلچسپی رکھنے والا عام قاری بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: اسسٹنٹ ایڈیٹر، پبلی کیشن ڈویژن، این سی ای آر ٹی، شری اروبندو مارگ، نئی دہلی۔ Mobile: 8539054888

□□□

ڈیجیٹل میڈیا اور اُردو زبان وادب
(سمینار کے مقالات)

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

تبصرہ: توحید حقانی☆

انسان ہمیشہ بہتر سے بہترین کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ انسانی تاریخ کے آغاز سے جس مقام تک آج ہم پہنچے ہیں اس میں سب سے اہم کردار اسی نظریہ کا ہے جس میں انسان بہتر کرنے کی چاہت رکھتا ہے۔ لکھنے کے عمل کو بہتر بنانے کی کوشش نے چھاپہ خانے کی ایجاد کی اور اس کے بعد کتابوں کا

صفحات: 314 قیمت:-/200 اشاعت:2025
ISBN 978-81-7121-248-4
ناشر: اردو اکادمی دہلی، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی-6
Email: urduacademydelhi@gmail.com

انقلاب دیکھنے کو ملا۔ اس کے بعد ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے سننے کے ساتھ دیکھنے کے عمل کی بھی شروعات کر دی۔ آج ٹیکنالوجی، اتنی ترقی کر گئی ہے کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہو گیا ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا کی ترقی نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دیں اور اپنی زبان کو اس سے ہم آہنگ کریں۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر غالب اکیڈمی نے ایک سمینار منعقد کیا جس میں گفتگو ہوئی کہ ڈیجیٹل دنیا میں اردو زبان وادب کی کیا صورتِ حال ہے؟ اسے کس طرح اور بہتر بنایا جا سکتا ہے؟ اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ زیرِ تبصرہ کتاب 'ڈیجیٹل میڈیا اور اردو زبان و ادب' ہے جسے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں مقدمہ اور ایک کلیدی خطبہ کے علاوہ ڈیجیٹل میڈیا اور اردو زبان وادب پر مبنی 33 مقالے شامل ہیں جنہیں چھ مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ حرفِ آغاز کے طور پر اردو اکادمی کے سکریٹری محمد احسن عابد نے لکھا ہے کہ دہلی کو نہ صرف ملک کی راجدھانی بلکہ زبانوں کی راجدھانی بھی سمجھا جانا چاہیے۔ اردو اکادمی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ڈیجیٹل دنیا میں ہو رہی تبدیلی اور اس میں اردو کی حصہ داری کو اپنا موضوع بنائے۔

پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ڈیجیٹل دنیا میں اردو زبان بہت پیچھے ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ اردو زبان سے تعلق رکھنے والے لوگ ڈیجیٹل دنیا میں ہونے والی ترقی کو بہت دیر سے اپناتے ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی نے 'ڈیجیٹل میدیا کا عصری تناظر اور امکانات' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس خطبہ میں انہوں نے ترسیل کے عمل میں آئی تبدیلی کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ انٹرنیٹ نے سماج میں مساوات کا وہ کام انجام دیا ہے جو سماج کئی دہائیوں سے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انٹرنیٹ پر موجود معلومات کسی غریب کی جھونپڑی اور امیر کے محل میں ایک جیسی پہنچتی ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا نے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے قاری تک پہنچنے کا آسان طریقہ فراہم کیا ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا اور خاص

طور سے سوشل میڈیا کے ذریعہ نیا ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے اور پرانے ادب کو لوگوں کے ساتھ بانٹا بھی جا سکتا ہے۔

مقدمہ اور کلیدی خطبہ کے علاوہ کتاب میں 33 مقالے شامل ہیں جنہیں چھ الگ الگ موضوعات کے تحت رکھا گیا ہے۔ چھ موضوعات میں پہلا موضوع 'ڈیجیٹل میڈیا اور اردو' ہے جس کے تحت آٹھ مقالوں کو شامل کیا گیا ہے۔ پہلا مقالہ معصوم مرادآبادی کا ہے جس کا موضوع 'ڈیجیٹل میڈیا اور اردو زبان' ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ دنیا کی زیادہ تر لائبریری اب ڈیجیٹل ہو چکی ہیں اور وہ اسکرین کے ذریعہ اپنے قاری تک آسانی سے پہنچ رہی ہیں۔ اردو کے رسائل اور اخبارات اب کاغذ وں کے محتاج نہیں رہے بلکہ کچھ تو ایسے ہیں جو صرف ڈیجیٹل شکل میں چھپ رہے ہیں۔

'زبان کی بقاء اور ڈیجیٹل میڈیا' کے موضوع پر سہیل انجم نے ڈیجیٹل دنیا میں زبان کے استعمال کی نوعیت کی بدلتی ہوئی شکل کو موضوع بنایا ہے۔ اموجی اور مخففات کے استعمال کی وجوہات اور اس سے ہونے والی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں کہ ڈیجیٹل میڈیا نے زبان کو نئے نئے الفاظ دیے ہیں جس سے ہر زبان کی ڈکشنری میں اضافہ ہوا ہے۔ مقالے میں وہ اس خدشہ کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ مخففات اور اموجی یا ہیش ٹیگ کا استعمال لوگوں میں ذخیرہ الفاظ کی کمی کا سبب بن رہا ہے۔ اسی حصہ میں لئیق رضوی کا مقالہ 'ڈیجیٹل میڈیا: چند معروضات' بھی شامل ہے۔ اس میں انہوں نے ڈیجیٹل میڈیا کو، الیکٹرانکس کی ایک شاخ بتایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے اردو کے شائقین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اردو کی آواز اب ان لوگوں کو بھی لبھا رہی ہے جو اس کے رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔

عرفان وحید اپنے مقالہ 'اردو کی ڈیجیٹل پرواز: لسانی ثقافت کا نیا عہد' میں سوشل میڈیا جیسے پلیٹ فارم پر اردو کے استعمال اور اس سے ہونے والی لسانی سرگرمی کو ثقافتی سرگرمی بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان پلیٹ فارمس نے بات چیت کے طریقے کو آسان بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر صدف فاطمہ اپنے مقالہ 'ڈیجیٹل عہد میں ادب کا ارتقا' میں لکھتی ہیں کہ ڈیجیٹل دور نے اردو کو جغرافیائی رکاوٹوں سے آزاد کر دیا ہے۔ ای بکس، آڈیو بکس، پوڈکاسٹ اور دیگر ویب سائٹ اردو ادب کا مواد ہر کسی کے لیے دستیاب کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر مسعود احمد کا مقالہ 'ڈیجیٹل میڈیا اور اردو زبان: مسائل اور امکانات' پر ہے۔ اس میں انہوں نے ایک اہم بات کہی ہے جسے میں حوالہ کے طور پر شامل کرنا چاہوں گا۔

''اس حقیقت سے انکار بد دیانتی کہلائے گی کہ ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونے میں دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی بہ نسبت اردو کے حصے میں تاخیر آئی ہے۔ جب اردو سے متعلق لوگ جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری سمجھتے ہیں تب تک دوسری زبانیں بہت آگے جا چکی ہوتی ہیں۔''

ان کا یہ کہنا پوری طرح حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ مقالے میں انہوں نے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں ڈیجیٹل میڈیا سے جڑنے سے زیادہ ضروری انہوں نے زبان کو اس کی اصل روح کے ساتھ وہاں تک پہنچانے کی بات کہی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ ایسی شخصیات اور چینلوں کا ذکر بھی کیا ہے جو اس کام میں سرگرم ہیں۔

دوسرے حصہ میں 'کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور اردو' کے تحت صرف ایک مقالہ 'اردو فونٹ کا ارتقا' کے موضوع پر ہے۔ اسے خواجہ اکرام الدین صاحب نے بڑی تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ کمپیوٹر فونٹس کی ایجاد کی تاریخ اور ترقی پر بات کرتے ہوئے وہ اردو فونٹس کی بات کرتے ہیں۔ خطِ نسخ سے لے کر خطِ نستعلیق کو اپنانے میں آنے والی دشواریوں پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ انگریزی کو کمپیوٹر پر لکھنا آسان سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس میں ایک حرف دوسرے سے مل کر کوئی نئی شکل نہیں بناتا۔ جبکہ اردو میں ایک حرف جب دوسرے سے ملتا ہے تو ایک الگ شکل بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی وجہ سے خطِ نستعلیق کو اس کی اصل شکل میں کمپیوٹر پر لانے میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مرزا جمیل احمد (لاہور) کی محنت نے بڑی خوبی سے اسے انجام دیا۔ ان کی مشقت اور کام کرنے کے جنون کا اعتراف کرتے ہوئے خواجہ اکرام صاحب نے لکھا ہے کہ آج دنیا ان کے نام سے واقف ہے۔ انہوں نے اکیلے، اپنے دَم پر ایک ادارے کا کام کیا۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے

کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں اب یونی کوڈ ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔اس مقالے کو پڑھ کرٹیکنالوجی میں اردوزبان کے حوالے سے ہونے والی ترقی کی مکمل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) پر مبنی ہےجس میں چار مقالے شامل ہیں۔ پہلا مضمون راغب اختر کا ہےجس میں وہ مصنوعی ذہانت کی تاریخ پر بات کرتے ہیں۔انہوں نے اس سے پیدا ہونے والے چیلنج اور اخلاقی پہلو پرزوردیا ہےجس میں ڈیپ فیک اور دیگر خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔انہوں نےمصنوعی ذہانت پرمبنی کچھ ویب سائٹ جیسے، کوپائلٹ، جیمنائی، چیٹ جی پی ٹی، ڈیپ سیک سے شاعری اورافسانے کی تخلیق کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں جو انسانی ذہن کوحیران کرنے کے لیے کافی ہیں۔ڈاکٹر رضی شہاب کا مقالہ صحافت میں مصنوعی ذہانت کے استعمال پر مبنی ہے ۔خبریں لکھوانا یا اس کی تفصیل حاصل کرنے کے علاوہ صحافتی اداروں میں اس کے استعمال سے ملنے والی آسانیوں پر بات کی گئی ہے۔صحافت کو درپیش چیلنجوں کو کم کرنے میں اس سے بہت مددملی ہے جیسے،فیکٹ چیک کرنااب بہت آسان ہو گیا ہے،کسی آڈیوکوتحریری شکل دینا بھی اس کی مدد سے آسان ہے۔

ڈاکٹر محمد یاسر کا مقالہ 'مصنوعی ذہانت اور اردو ادب' پر ہے۔اس میں اردوادب کے تخلیقی پہلو کے علاوہ تنقیدی عنصر، قواعد اور ترجمہ سے متعلق باتیں شامل ہیں جسے دیکھ کرحیرانی ضرور ہوتی ہے کہ اےآئی (A.I.) کی ذہانت کس حد تک ادب کو سمجھ رہی ہے۔اس حصہ کا آخری مقالہ ڈاکٹرامیرحمزہ کا ہے جس میں انہوں نے اردو کے ڈیجیٹل شکل میں آنے کے مرحلہ کوتفصیل سے بیان کیا ہے۔اردوکا پہلا گروپ جہاں رومن میں اردوشاعری کا لکھا جانا اور آج اے آئی کے دَورتک اردو کے ڈیجیٹل سفر کی عکاسی ان کے مضمون کا موضوع ہے۔

چوتھا حصہ'تعلیم وتدریس اورڈیجیٹل میڈیا' سے تعلق رکھنے والے مقالوں کا ہے۔ اس میں آٹھ مقالے شامل ہیں جو اردو زبان میں تعلیم و تدریس پر مبنی ویب سائٹ، ای لرننگ، ای کنٹینٹ، ایجوکیشنل پورٹل، ای بکس، ڈیجیٹل لغات اورایسے ہی دستیاب دیگرسہولیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ان سارے مضامین کو پڑھ کر اتنا تو ضرورمحسوس ہوتا ہے کہ اردوزبان، اس سمت بہت تیزی سے ترقی کررہی ہے بلکہ وہ کئی زبانوں سے آگے نکل گئی ہے۔ ریختہ جیسی ویب سائٹ کا حوالہ اردو کے ای کنٹینٹ اور ای لرننگ پلیٹ فارم کے طور پر دیا گیا۔ اگرغور کریں تو ہندی زبان میں بھی اس طرح کی ویب سائٹ موجودنہیں ہے۔

کتاب کے اگلے حصہ میں'ڈیجیٹل میڈیااورادب' کے تحت پانچ مقالے شامل ہیں جس میں سوشل میڈیا پر اردو ادب کے تخلیقی، تنقیدی اورتحقیقی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آخری حصہ میں سات مقالے شامل ہیں جوڈیجیٹل میڈیااوراردوصحافت کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔اس میں اردو کے آن لائن رسالے، اردو کی نشریاتی صحافت، ڈیجیٹل دنیا میں اردوصحافت کی قسموں پر، مقالات میں تفصیلی گفتگو شامل ہے۔

کتاب میں شامل ہرایک مضمون اپنی اہمیت آپ رکھتا ہے۔ڈیجیٹل میڈیا کی تاریخ اورتمہیدی گفتگو کچھ مقالوں میں ایک جیسی معلوم ہوتی ہےلیکن وہ مضمون لکھنے والے کے تجربات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی شخص کو اردو کی، ڈیجیٹل دنیا کی ازسرِ نومعلومات درکار ہوتو اسے اس کتاب کوضرور پڑھنا چاہیے۔ کئی مضامین تو اس نوعیت کے ہیں کہ اسے حوالہ کے طور پربھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔کتاب کو پڑھتے وقت ایک کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اس میں صرف ڈیجیٹل میڈیا کی تاریخ اورموجودہ صورتِ حال پر بات کی گئی ہے۔ اردو کوڈیجیٹل دنیا میں درپیش خطرات اورچیلنجز پر کسی ٹھوس بات کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔کوئی حل پیش نہیں کیا گیااور نہ ہی اس کی کوئی صورت بتائی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقالہ لکھنے والوں میں زیادہ تر لوگ ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ایسا کوئی نہیں تھا جس کے پاس تکنیکی مہارت ہو۔اگر ایسے لوگوں سے بھی مضمون لکھوایا جاتا جوڈیجیٹل دنیا کی مہارت رکھتے ہوں تواور بہترصورت ابھر کرسامنے آسکتی تھی نیزتکنیکی دشواریوں کی نوعیت اوراسے دورکرنے کی شکل بھی سامنے پیش کی جاسکتی تھی۔

☆ مبصر کا پتہ: (ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی)
45/1 فلیٹ نمبر 103 بٹلہ ہاوس، جامعہ نگر، دہلی-110025
Mobile: 9999272179

❑❑❑

اوراقِ گم گشتہ محشر

مصنف: مولانا محبّ الحق محشر حسینی

مرتبہ: زہرہ خاتون

تبصرہ: ابراہیم افسر☆

مولانا محبّ الحق محشر حسینی نہ صرف عالم دین بلکہ جنگِ آزادی کے مجاہد، حکیم، شاعر، اور افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیو بند سے دینی تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق اتر پردیش کے انقلابی شہر بلیا کے موضع چندائر سے ہے۔ ان کے خاندان کے کچھ افراد تقسیم ہند کے دوران پاکستان ہجرت کر گئے اور کچھ نے ہندوستان میں ہی سکونت کا فیصلہ کیا۔ زیر نظر کتاب کو مولانا کی نواسی ڈاکٹر زہرہ خاتون (استانی شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ پہلے اس کتاب کو کراچی میں موجود مولانا کی نواسیاں شائع کرنا چاہتی تھیں لیکن ڈاکٹر زہرہ خاتون نے تمام اہلِ خانہ کی رضا مندی سے اسے نئی دہلی سے شائع کیا۔

ڈاکٹر زہرہ خاتون نے زیر نظر کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے 'ادبی مضامین' میں مولانا کے تین مضمون الااللہ، فاران کی نور بار تجلی اور خاتم الانبیاء کا پیغام کے علاوہ افسانوی مجموعہ 'افتاد' جس میں 11 افسانے شامل ہیں۔ ان میں اسٹیل بکس، رہ نما، نیا جوتا، اندھی دنیا، چُنیّا شاہ، من کا بھید، افتاد، بابو جی، یاسمین، سنہرا خواب اور ویٹنگ روم اہمیت کے حامل ہیں۔ دوسرا حصہ 'شعر' پر مبنی ہے جس میں مولانا کے تمام کلام کو مرتبہ نے بڑی ہی جاں فشانی کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مولانا محب الحق محشر حسینی کی تحریر کا عکس قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 296 قیمت:-/400 اشاعت:2025
ISBN 978-81-94460-5-4
ناشر: ڈاکٹر زہرہ خاتون، D-178، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025 موبائل:9810906056

محب الحق محشر حسینی نے اپنے مضمون 'الااللہ' میں اس کائنات کے وجود میں آنے کے جواز کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں خدا کی وحدانیت و حقانیت اور حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ 'فاران کی نور بار تجلی' میں مولانا نے اس سرزمین میں اللہ کا پیغام سنانے والے الانبیا کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی مدلل باتوں سے اللہ رب العزت کے پیغام کو لانے والے رسولوں اور پیغمبروں کے مشن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون اصلاح معاشرہ کے ساتھ قرآنی تعلیمات کا مصدر ہے۔ تیسرے مضمون 'خاتم الانبیاء کا پیغام' میں مولانا نے تمام شاہانِ روئے زمین کے نام پیغام تحریر کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون مختصر ضرور ہے لیکن اس کا پیغام وسیع ہے۔

محب الحق محشر حسینی نے اپنی شاعری سے عوام الناس کو بیدار کرنے کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کی شعری کائنات میں اصلاحِ معاشرہ کے موضوعات پر بہت سی نظمیں شامل ہیں۔ وہ حکمت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے امراض کا علاج شاعری سے کرنے میں یقین کرتے تھے۔ انہوں نے معاشرے میں پنپنے والی برائیوں پر اپنی شاعری سے سخت لہجے میں چوٹ کی۔ 'کعبہ کا برہمن' میں انہوں نے اُن لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو قبروں، مزاروں پر چادر اور پھول چڑھا کر بھولے بھالے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں انہوں نے واعظانہ انداز میں اپنی بات پیش کی:

کیا فرق رہا باقی اب شیخ و برہمن میں
وہ پوجے مزاروں کو، یہ بُت کی کرے پوجا
وہ پھول چڑھاتا ہے دریا پہ اگر جا کر
قبروں پہ یہاں دیکھو چڑھتا نہیں کیا سہرا
اللہ تو غارت کر کعبہ کے برہمن کو
جو بیچ کے کھاتا ہے اسلاف کے مدفن کو

محب الحق محشر حسینی نے اپنے کلام کے ذریعے اصلاح معاشرہ کے علاوہ قوم کے رہبروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے ایسے نام نہاد علما پر سخت چوٹ کی جو ظاہری طور پر دین کے علم بردار اور مبلغ بنے ہوئے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ دینِ اسلام کے احکامات کی قدم قدم پر پامالی کرتے ہیں۔

محشر صاحب نے ایسے عالموں کو اپنا رہنما ور ہبر ماننے سے انکار کیا۔انہوں نے اپنی نظم 'مولوی' میں بدکردار و بداخلاق علماء سو پر سخت تنقید کی ہے۔ظاہر ہے کہ اس نظم میں بدکردار علما کو تنقید کا نشانہ اس لیے بنایا گیا کہ وہ اپنے نصب العین اور بھولے ہوئے سبق کو یاد کرلیں۔کیوں کہ محشر حسینی خود عالم دین تھے اور عالموں کے عادت واطوار سے بہ خوبی واقف تھے۔اس لیے انہوں نے 'مولوی' نظم میں جو باتیں کہیں وہ ان کے دل کے جذبات کو عیاں کرتی ہیں۔محشر حسینی نے اس نظم کو مسدس کے پیرائے میں تخلیق کیا اور ہر بند بہت ہی کارآمد و مفید ہے۔نظم 'مولوی' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے جس میں محشر حسینی نے مولویوں کے طرز عمل پر شدید ردِعمل کا اظہار کیا ہے:

خدا ہی جانے وہ کیا جانتے ہیں
مگر پھر بھی ہم سے سوا جانتے ہیں
وہ گنڈے کے ماہر، دعا جانتے ہیں
وہ روٹی کا ہر مسئلہ جانتے ہیں
وہی مولوی رہ نما ہیں ہمارے

محب الحق محشر حسینی نے سماج کی اصلاح و مسائل کو اپنے کلام میں شامل کرنے کا نصب العین بنایا ہوا تھا۔انہوں نے امیروں اور غریبوں کے درمیان پیدا شدہ اقتصادی کھائی کو بہ غور دیکھا تھا۔وہ خود اپنے یہاں آنے والے غریب مریضوں سے پیسہ نہیں لیتے تھے۔بعض مرتبہ غریب مریضوں کے گھر جا کر ان کا علاج مفت کرتے۔محشر حسینی نے مسلم معاشرے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا جس انداز میں منظر پیش کیا، اسے پڑھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آنا لازمی ہے۔نظم 'غریبوں کی شادی' کھوکھلے معاشرے کی کڑوی سچائی ہے۔یہ نظم انہوں نے آج سے ستر اسّی سال قبل لکھی ہوگی لیکن حالات میں آج بھی فرق نہیں آیا ہے۔اس نظم کو لکھنے کے بارے میں محشر حسینی نے خود لکھا ہے'' کہ ایک 'بھر' کی لڑکی بیاہی جارہی تھی، بارات جس طرح آئی تھی، جیسے ٹھہری تھی اور جس حال میں رخصت ہوئی، مجموعی طور پر یہ تمام تر مناظر 'دیدۂ عبرت نگر' کے لیے بہت ہی درد انگیز تھے۔اُن تاثرات کو جو ذہن و دماغ پر طاری ہوئے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔کاش! اس کو لوگ شاعری نہ سمجھتے بلکہ مستقل غور وفکر کے لیے ایک اہم موضوع تصور کرتے۔''اس نظم میں انہوں نے مزدوروں اور افلاس زدہ لوگوں کے گھروں اور مالی حالت کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا ہے۔اس نظم کو پڑھ کر احسان دانش کی اُن نظموں کی یاد تازہ ہوجاتی ہیں جو انہوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔اس نظم کو ہم ترقی پسند نظریات کی نمایندہ نظم قرار دے سکتے ہیں۔یہ وہی زمانہ ہے جب یہ تحریک عروج پر تھی۔اس نظم میں بھوک، افلاس، غربت اور ناہمواری کی باتیں بے باک انداز میں کہی گئی ہیں۔نظم کے آخر میں محشر حسینی نے اللّٰہ رب العزت سے دعا کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔نظم 'غریبوں کی شادی' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے جس میں محشر حسینی نے آنکھوں دیکھا منظر اس انداز میں بیان کیا کہ دل لرز جائے:

بارات تھی آئی ہوئی اور بیاہ کا گھر تھا
ہر چیز مگر چپ تھی، کوئی شور نہ شر تھا
دولت تھی نہ دولت کا دھواں دھار تماشہ
ڈھولک تھی نہ نوبت تھی نہ باجہ تھا نہ تاشہ
عشرت کے تھے اسباب نہ آرام کی چیزیں
ملتی ہیں غریبوں کو کہاں کام کی چیزیں

بہرنوع! ڈاکٹر زہرہ خاتون نے اپنے نانا جان کی بکھری ہوئی چیزوں کو تلاش و تحقیق کے بعد کتابی قالب میں پیش کر اسے حیاتِ جاوداں عطا کی۔انہوں نے زیر نظر کتاب میں محشر حسینی کے اوصاف حمیدہ و خصائل کے بارے میں بہت مختصر لکھا لیکن جتنا لکھا وہ قابلِ تعریف ہے۔ڈاکٹر زہرہ خاتون نے محشر حسینی کے بارے میں اپنے والد اور مشہور صحافی رضوان اللّٰہ کا لکھا ہوا غیر مطبوعہ خاکہ 'خسر محترم' شامل کیا۔انہوں نے اپنے نانا جان کی حب الوطنی اور قوم وملت کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ڈاکٹر زہرہ خاتون نے اپنے مقدمے میں محشر حسینی کے حالاتِ زندگی، کلام، حقیقت نگاری اور سماجی مسائل اور تمام ادبی کارہائے نمایاں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔موصوفہ کی خالہ زاد بہن قمر جبیں کے تاثرات 'نانا جان مرحوم' کو شاملِ کتاب کیا جس میں انہوں نے اپنے نانا کے بارے میں بہت ہی جامع انداز میں گفتگو کی ہے۔کراچی میں مقیم سیما صدیقی کا ایک مختصر نوٹ 'ہمارے نانا' عنوان سے شامل ہے جس میں محب الحق محشر حسینی

کے بارے میں چند باتیں تحریر ہیں۔ پروفیسر سید کلیم اصغر نے اپنے تاثرات میں زیر نظر کتاب اور ڈاکٹر زہرہ خاتون کے بارے میں مدلل گفتگو کی ہے۔

اس موقع پر راقم ڈاکٹر زہرہ خاتون کو مبارک باد پیش کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے اجداد و اسلاف کے ادبی کارناموں کو قصۂ پارینہ بنانے سے بچایا ہے۔ کتاب کی پشت پر موصوفہ نے اُس گھر کی تصویر پیش کی جس میں محشر حسینی نے اپنی زندگی بسر کی۔ کتاب کا سرورق بہت ہی دیدہ زیب اور قیمت مناسب ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ—250501 (یوپی) موبائل 9897012528

□□□

تاریخ انصاریان

(تذکرۂ علما و فضلا خاندان انصاری کشمیر)

مصنف: مسرور عباس انصاری

تبصرہ: ایم طاہر☆

اس میں شک نہیں کہ مسرور عباس انصاری صاحب نے یہ کتاب تحریر فرما کر بڑا کام انجام دیا ہے۔ آنے والے وقتوں میں اگر کسی کو اس موضوع پر تحقیقی مقالہ یا مضمون لکھنا ہو تو حوالے کے لیے کتب خانوں اور لائبریریوں کی خاک نہیں چھاننا پڑے گی بلکہ کشمیر کے تعلق سے 600 سالہ انصاری تاریخ ایک ہی جگہ پر میسر ہو جائے گی۔

اس ایک کتاب میں بیک وقت انصاری خاندان کے جلیل القدر علما، شعرا و دانشوروں کا تفصیلی ذکر تو ملے گا ہی؛ ساتھ ہی عام طور پر انصاری حضرات کے سلسلے سے عوام میں جو غلط فہمیاں گھر کر گئی ہیں ان کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔

صفحات: 472 قیمت:-/500 اشاعت: مئی 2025

ISBN 978-93-90579-7-23

ناشر: سفینہ پبلی کیشنز، سری نگر۔ موبائل: 9419442037

بہ اہتمام: ایپلائڈ بکس، نئی دہلی۔ موبائل: 9953630788

ایک اور خوبی جو اس کتاب میں ہے وہ یہ کہ یہ کتاب مسلکی تضاد سے اوپر اُٹھ کر لکھی گئی ہے اور تمام واقعات تاریخی حوالوں کے ساتھ من و عن پیش کر دیے گئے ہیں، بغیر کسی لاگ لپٹ کے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ عام طور پر جہاں اپنے اجداد کا ذکر آتا ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ چشم پوشی سے کام لیتے ہیں اور نقائص سے صرف نظر کرتے ہوئے تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں؛ لیکن یہاں بے جا تعریف کے قلابے نہیں ملائے گئے بلکہ تاریخی اعتبار سے اجداد اور ہم برادری حضرات کی طرف سے ماضی میں کیے گئے غلط اقدامات کا کھلے دل سے بے خطر اعتراف بھی کیا گیا ہے جو کتاب کو مزید اعتبار بخشتا ہے۔ مثال کے لیے 'بعض غیر سیاسی اقدامات' کے ذیل میں ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''انصاری خاندان کے علماء... سیاسی نوعیت کی بعض غلطیوں کے بھی مرتکب ہوئے جن سے قومی شیرازہ بکھرنے کا امکان پیدا ہوا... جو لوگ اپنی تاریخ اور اس کے ٹھوس حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں دراصل وہ تاریخ کو مسخ کرتے ہیں اور ان کی مثال اس بوڑھے آدمی جیسی ہے جس کی آنکھیں دھندلائی ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنی عینک توڑتا ہے۔ بعض ایسے غیر سیاسی اقدامات بھی اٹھائے گئے جس کی وجہ سے اس امتیازی خصوصیت کو شدید دھچکا لگا جس کی بنا پر یہ خاندان صدیوں سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا آیا ہے اور یہ اس دیرینہ موقف سے بھی انحراف تھا جو اس خاندان کے علماء کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ مجھے اس ناقابل تردید حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ کچھ تاریخی نوعیت کے غلط سیاسی فیصلوں کا خمیازہ اقوام کو صدیوں تک اٹھانا پڑتا ہے۔''

(ص:166 تا 167)

اسی طرح آگے اسی ضمن میں ایک دوسرے مقام پر تحریر ہے:

''سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ فرقہ قدیم و فرقہ جدید کے معرض وجود میں آنے کے بعد علماء نے اس منفی طرز عمل کی حوصلہ افزائی کی اور اسے ختم کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں اٹھایا... دونوں فرقے محض شک کی بنیاد پر ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرنے لگے، اوقاف کی ملکیتیں اور امام باڑے تقسیم

ہوئے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں (مریدوں)، ذاکروں اور مساجد کا بٹوارہ شروع ہوا جو بدقسمتی سے صدیوں کے بعد آج بھی جاری ہے اور قوم کا بکھرا شیرازہ، پسماندہ حالت، منقسم اجتماع اور غیر موثر کردار اپنی زبوں حالی پر گریہ کناں ہے۔'' (ص:170)

اس کتاب کی ایک اور ندرت کہوں تو بہتر ہوگا وہ یہ ہے کہ آخری صفحات میں 'شجرہ نسب' کے ساتھ ساتھ 'مربوط تاریخی واقعات' کو بھی سنہ وہجری سمیت سلسلہ وار ایک ٹیبل (جدول) کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ 'منابع و مآخذ' کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے جو اس کتاب کی افادیت بڑھانے کے ساتھ قاری کے بھروسے میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

اردو کتب کا ایک عمومی المیہ ہے کہ مصنف یا مؤلف، اس بات کو قطعی ضروری نہیں سمجھتے کہ چھپنے سے پہلے مسودہ کو کسی معتبر ایڈیٹر سے درست یا ایڈٹ (Edit) اور کسی ماہر سے اس کی وٹنگ (Vetting) کروالی جائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کتاب پیش کرنے میں کہیں اگر بچت کرنے کی گنجائش ہوتی ہے تو وہ انہی دو 'غیر ضروری' مراحل میں ہوسکتی ہے؛ اور یہی معاملہ اس کتاب کے ساتھ بھی ہوا لگتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کتاب کی ضخامت کافی حد تک کم کی جاسکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ بہت سے منابع سے مواد یکجا کیا گیا ہے اور بغیر ملان کیے ویسے ہی تحریر کر دیا گیا ہے؛ چنانچہ ایک ہی مضمون کی الگ الگ سرخیوں کے ساتھ تکرار، قاری کے ذہن پر بھاری پڑتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ ہر دوسرے صفحے پر 'عربیائی' اردو اور 'کشمیری' اردو' کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ ایسے الفاظ تحریر ہیں جو اردو ادب میں مستعمل نہیں ہیں اور نہ ہی عام اردو قاری ان سے واقف ہے۔ یہ ایسی لغزش ہے جو 'وٹنگ' کے ذریعے آسانی سے دور کی جاسکتی تھی۔ مثال کے لیے وہ الفاظ تحریر کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ پوری کتاب ان سے بھری پڑی ہے۔

کتاب پڑھتے وقت ایک اور بات محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ شاید (یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے) دوسری زبانوں سے ترجمہ، AI یا 'گوگل' کے ذریعے بھی کیا گیا ہے؛ کیوں کہ 'وکی پیڈیا' کے استعمال کا تو کتاب میں حوالہ خود موجود ہے، لہٰذا عجب نہیں کہ AI سے بھی مدد لی گئی ہو (پڑھتے وقت جملوں کی ساخت اور بندش کئی جگہ ایسے اشارے بھی دیتی ہے) برائے نمونہ ملاحظہ ہو:

''...اور واپسی پر پکھلی میں 786ھ کو وفات کیا اور آپ کو تاجکستان کے دارالخلافہ دوشنبہ کے نواحی شہر ختلان میں دفن کیا گیا...اور یہاں اشاعت اسلام کی کوششوں میں سرعت بخشی۔''

مجموعی طور پر یہ کتاب نہایت مفید ہے خصوصاً ایک سورس بک (Source Book) کے طور پر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کتاب کو اردو لائبریریوں کے ساتھ ساتھ ہر اس شخص کے پاس ہونا چاہیے جسے کشمیری تاریخ میں دلچسپی ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کتاب کا آئندہ ایڈیشن مذکورہ چند خامیوں سے پاک ہوگا۔

☆ مبصر سے رابطہ: (نوئیڈا، NCR) Mob: 9891319310

□□□

ذکر حیات (صوفی ابوالمعالم خاں)

مصنف: محمد شکیل استھانوی

تبصرہ: ریاض احمد قادری☆

یہ کتاب نامور صوفی حافظ ابومعالم خان اعظمی (رحمہ اللہ) کے تذکار پر مشتمل ہے۔ ان کی پیدائش 10 دسمبر 1949 کو موضع بخش پور، ضلع اعظم گڑھ میں اور وفات 25 مئی 2012 کو ہوئی۔ سوانح نگار نالندہ کے متوطن جناب محمد شکیل استھانوی ہیں جو صوفی صاحب کے پیر بھائی ہیں۔ انہوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور فی الحال بہار قانون ساز کونسل پٹنہ کے اردو سیکشن میں خدمت گزار ہیں۔ شکیل صاحب تصنیفی ذوق بھی رکھتے ہیں اور اسی کتاب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ

صفحات: 188 قیمت: -/250 اشاعت: 2022
ISBN 978-93-94616-76-6
زیر اہتمام: صفا ایجوکیشنل ٹرسٹ، استھانواں، نالندہ (بہار)
Mobile: 9631629960
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-2

ان کی چندسوانحی کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔

سوانح لفظ سانحہ کی جمع ہے، جو واقعات اور روداد کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ سوانح نگاری اردو ادب کی ایک مستقل صنف ہے، جس میں کسی شخصیت کے حالات زندگی (یعنی خاندان، پیدائش، تعلیم، مشاغل، اہم کارنامے، وفات، عادات و اخلاق وغیرہ) ترتیب سے بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح میں جس قدر مستند اور جامع مواد سچائی اور حقیقت نگاری کے ساتھ نیز حسین ترتیب کے ساتھ جمع کیا جائے گا اسی قدر وہ بہتر سوانح تسلیم کی جائے گی۔ حالؔی کی تصنیف حیات سعدی اور یادگار غالب، علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی اور سوانح مولانا روم، علامہ سیّدسلیمان ندوی کی حیات امام مالک، سیرت عائشہ، حیات شبلی وغیرہ اور صالحہ عابد حسین کی یادگار حالی اردو ادب کی اہم سوانحی تصنیفات ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب بھی ایک سوانحی تصنیف ہے۔ اعتبار نامہ کے طور پر کتاب کے آغاز میں بزرگ ادیب جناب ناوک حمزہ پوری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، مبصر ڈاکٹر سیّد ریحان غنی، صحافی راشد احمد اور تجزیہ نگار زبیر احمد بھاگلپوری جیسے باوقار افراد کی تقریظات شامل ہیں۔ اس کے بعد مؤلف کا تحریر کردہ 6 صفحے کا مقدمہ ہے جس میں مختصراً صالحین و اولیا کی روحانیت کا ذکر ہے اور صاحبِ تذکرہ سے اپنی عقیدت مندانہ وابستگی کا اظہار بھی۔ چار صفحات میں ممدوح کا مختصر سوانحی خاکہ ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد قاری اصل کتاب تک پہنچتا ہے جو صفحہ 32 سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ 107 پر ختم ہوجاتی ہے، یعنی کُل 75 صفحات پر مشتمل یہ سوانح عمری ہے۔ بعد کے صفحات میں صوفی ابومعالمؒ کے خلفاء کا تذکرہ ہے۔ تقریظات اور مقدمہ وغیرہ سے گزر کر جب راقم السطور صفحہ 32 کی دوسری سطر میں پہنچا تو دماغ ہل گیا، دل مایوس ہوگیا، پہلی سطر سے عبارت کو پھر پڑھا، لیکن ذہن قبول کرنے پہ آمادہ نہ ہوا، عبارت یوں ہے:

''ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں حضرات صوفیائے عظام نے اسلام اور اس کی روح کی نشر و اشاعت میں کس قدر ہزیمت اٹھائی اور کتنی قربانیاں دی ہیں۔''

عبارت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ صوفیا نے اسلام کی نشر و اشاعت میں بڑی ہزیمت اٹھائی۔ لغت میں 'ہزیمت اٹھانا' پسپا ہونا یا بھاگ جانا یا شکست کھاجانا کے معنی میں مستعمل ہے۔ مصنف شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صوفیائے عظام نے اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بڑی مشقت اٹھائی، لیکن ایک غیر مناسب لفظ 'ہزیمت' کی وجہ سے مفہوم ہی بدل گیا۔ ایک سطر بعد مصنف رقم طراز ہیں:

''اسلامی مشن کی کامیابی کے لیے جان و مال، عزت و آبرو اور گھر بار سب کچھ لٹا دیا۔''

عزت و آبرو گنوانا یا آبرو لُٹنا اصل میں عصمت میں داغ لگنا یا عزت کا برباد ہونا یعنی بےآبرو ہونے کا مفہوم بیان کرتا ہے اور موقع کے اعتبار سے یہ لفظ مناسب نہیں۔ سطر 7 سے 10 تک میں 'جو' کا لفظ 6 مرتبہ استعمال ہوا ہے، اہل ذوق کو یقیناً یہ تکرار گراں گزرے گی۔ ایسی مثالیں کتاب کے اندر متعدد جگہ موجود ہیں۔ آخری سطر میں اپنے ممدوح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''جن کی زندگی شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی مرقع تھی۔'' اہل زبان کے یہاں لفظ مرقع مذکر ہے لہٰذا 'معرفت کا مرقع تھی' لکھنا درست ہے۔ جب کہ مصنف نے صفحہ 69 پر اس لفظ کو مذکر کے طور پر ہی استعمال کیا ہے جو یقیناً درست ہے۔ صفحہ 37 میں حدیث کی کمپوزنگ میں بھی غلطی ہے۔ سنن ابوداوٗد میں حدیث کے الفاظ یوں ہیں ان البذاذۃ من الایمان (بالیقین سادہ لباسی ایمان کا حصہ ہے)۔ لفظ ریش بمعنی داڑھی مؤنث ہے اسے صفحہ 41 پر مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ صفحہ 43 و 61 میں مؤلف نے لکھا ہے کہ ان کے مریدین غیر مسلم بھی تھے، یہ بات محل نظر ہے۔ کتاب میں توجہ و نسبت، مراقبہ، مجاہدہ، پاس انفاس، ذکر خفی و ذکر جلی اور لطائف وغیرہ کا ذکر ہوا ہے۔ یہ سب تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ بہتر ہوتا کہ حاشیہ میں اس کی مختصر تشریح ہوجاتی۔

مؤلف نے اپنے ممدوح حضرت صوفی ابومعالم کو مستجاب الدعوات میں شمار کیا ہے۔ صوفیائے کرام کی یہ بھی ایک منفرد شان ہوتی ہے کہ ان کی دعاؤں کی برکت سے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں اور دل اللہ کی جانب مائل ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں مؤلف نے جن چند کراماتی واقعات کا ذکر کیا ہے،

مثلاً (سگ گزیدہ) بغیر انجکشن کے ٹھیک ہوگیا، سامان مل گیا، جنات نے اپنا راستہ بدل دیا، کند ذہن طلبا کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا، گم شدہ لڑکا مل گیا، شادی طے ہوگئی، پیر تسلیم کرلیا، کمشنر کی چھٹی ہوگئی، خبیث بھاگ گیا وغیرہ۔ انہیں پڑھ کر مریدین کا حلقہ تو خوش ہوجائے گا، لیکن کرامت (حق ہونے کے باوجود) اکابر صوفیا کے حلقوں میں بزرگی کا معیار اور دلیل نہیں۔ ان کے یہاں ایسے واقعات کی زیادہ اہمیت نہیں، ان کے یہاں ظاہر و باطن کی درستگی اور فکر و عقائد کی پختگی ضروری ہے۔ کاملین تو الاستقامة فوق الکرامة (ثابت قدمی کا درجہ کرامت سے بلند ہے) کے قائل ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اسلام سے متعلق مجھے ایسی پختہ بات بتادیجیے کہ آپ کے بعد کسی غیر سے اس کے متعلق کچھ نہ پوچھوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: قل آمنت باللہ ثم استقم یعنی زبان سے کہو میں نے اللہ پر یقین کیا، پھر اسی پر ثابت قدم رہو۔ (صحیح مسلم و جامع ترمذی)۔ زندگی کا یہی وہ اعلیٰ معیار ہے جو اصحاب کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی روش رہی اور اولیائے کاملین بھی ہمیشہ اسی طریقے پر گامزن رہے۔

صوفی حافظ ابومعالم کے حالات میں یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ ایک صاحبِ نسبت بزرگ تھے اور اپنے مریدوں کو فرائض و واجبات کے ساتھ سنن و نوافل کی بھی تاکید کرتے تھے، تلاوت قرآن اور ذکر درود پاک پر مداومت کے ساتھ ذکر جہری، مراقبات اور پاس انفاس پر بھی زور دیتے تھے۔ مخصوص مریدین کو لطائف عشرہ تک کی تعلیم و نسبت سے سرفراز کردیتے تھے۔ میری محدود نگاہ میں ایسے صاحبِ نسبت افراد اب عنقا ہیں اور بڑی بڑی خانقاہوں و درگاہوں میں بھی صاحبان نسبت بزرگ نہیں ملتے۔

کتاب کے آخر میں صوفی ابومعالم (رحمہ اللہ) کے مختلف شجرۂ سلاسل کو بھی درج کیا گیا ہے۔ ان میں قادریہ، شاذلیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ، صابریہ، قرنیہ (اویسیہ) اور مجددیہ سلسلوں کے شجرے مع تفصیلات مذکور ہیں، جو وابستگان سلسلہ کے لیے نعمت گراں مایہ ہیں اور دیگر سلاسل سے وابستہ افراد کے لیے بھی معلومات افزا ہیں۔

کتاب کا کاغذ عمدہ، کتابت روشن اور کور پیج نفیس ہے۔ لیکن کمپوزنگ کی غلطیاں جا بجا ہیں۔ زبان و بیان کی ناہمواری اور کتابت کی خامیاں نظر کو چبھتی ہیں، انہیں آئندہ دور کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔

☆ مبصر کا پتہ: J-31/78 کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316

□□□

ماہنامہ چہارسُو، راولپنڈی
(گوشہ ڈاکٹر مشتاق اعظمی)
بانی مدیر اعلیٰ: سیّد ضمیر جعفری
مدیر مسئول: گلزار جاوید

تبصرہ: محمد عارف اقبال

ماہنامہ 'چہارسُو' راولپنڈی نے ادبی شخصیات پر خصوصی گوشہ شائع کرنے میں بڑا نام کمایا ہے۔ گزشتہ 34 برسوں سے مسلسل شائع ہونے والا یہ ادبی رسالہ کبھی ڈائجسٹ سائز میں نکلا کرتا تھا۔ 'چہارسُو' کے بانی مدیر سیّد ضمیر جعفری نے اس کے ادبی گوشے کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور 'زندگی کے ساتھ ساتھ' کو رسالہ کا سرنامہ بنادیا۔ ہند و پاک کے درمیان ڈاک کی آسان ترسیل کے زمانے میں 'چہارسُو' دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا لیکن ایک عرصہ سے اس کا پرنٹ ایڈیشن عنقا ہے۔ تاہم پی ڈی ایف کی صورت میں کبھی کبھی اس کے چند شمارے نظر نواز ہوجاتے ہیں۔ حال ہی میں ماہنامہ 'چہارسُو' کا مشترکہ شمارہ (جنوری، فروری 2026) میری نظر سے گزرا۔ اس کا سرورق ہندوستان کی ایک اہم ادبی شخصیت کی

جلد 35، شمارہ: جنوری، فروری 2026، صفحات: 122
زرسالانہ: درج نہیں، پتہ: 537/D-1 گلی نمبر 18، ویسٹرج III، راولپنڈی-45000 (پاکستان) M: +92 3360558618
Email: chaharsu@gmail.com

تصویر سے مزین ہے۔ اندرون کے صفحات کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ جانی پہچانی شخصیت اور کوئی نہیں بلکہ ڈاکٹر مشاق اعظمی کی ہے جن کا دولت کدہ صوبہ مغربی بنگال کے سرحدی شہر آسنسول میں واقع ہے۔

ماہنامہ 'چہارسُو' کے اس تازہ شمارے میں 'قرطاسِ اعزاز' کے عنوان سے مشاق اعظمی کا گوشہ شامل ہے۔ دیگر مضامین و تخلیقات حسب معمول ہیں جن میں افسانے، سفرنامے، شعری تخلیقات، تراجم وغیرہ کی شمولیت ہے۔

ڈاکٹر مشاق اعظمی کا گوشہ تقریباً 40 صفحات کو محیط ہے۔ 'قرطاسِ اعزاز' کا آغاز علقمہ شبلی (مرحوم) کے شعری آہنگ سے کیا گیا ہے اور مخاطب مشاق اعظمی ہیں۔ اس گوشہ کے اول و آخر میں مشاق اعظمی کے ادبی اور جذباتی رشتے کو مختلف تصاویر کے البم میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام آباد (پاکستان) کے محمد انعام الحق نے ایک صفحہ میں مشاق اعظمی کے زندگی نامہ کو سمیٹ دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشاق اعظمی (پ:3 نومبر 1944) کا تعلیمی، تدریسی اور تخلیقی سفر جاری ہے کیونکہ ان کا شغل اب بھی 'پڑھنا اور گاہے گاہے لکھنا' ہے۔ مشاق اعظمی اپنی تدریسی زندگی کو اس اعتبار سے بہتر اور مثالی قرار دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبا و طالبات پر ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے:

''مشاق اعظمی اردو کے ایسے استاد ہیں، جنہوں نے طالب علموں کی زندگی کو اپنی زندگی جانا۔ اچھا استاد اپنے طلبا پر وقت ہی صرف نہیں کرتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انہیں کے لیے جیتا ہے۔''

شری شنکرا چاریہ سنسکرت یونیورسٹی، کیرلا کی ایک طالبہ فرزانہ ٹی کے نے 2017 میں مشاق اعظمی کے افسانوں کا مجموعہ نارسیدہ کے حوالے سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مشاق اعظمی کی شخصیت اور خدمات پر 2019 میں مغربی بنگال اردو اکادمی نے آسنسول میں سمینار کا انعقاد بھی کیا تھا۔

'چہارسُو' نے ڈاکٹر مشاق اعظمی کے گوشے میں خطوط، انٹرویو اور مضامین شامل کر کے مشاق اعظمی کی معتبر شخصیت کو مزید استناد بخشا ہے۔ وہ اگرچہ اچھے شاعر بھی ہیں لیکن تخلیقی ادب میں افسانے کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ آدھا آدمی (2000ء) اور نارسیدہ (2012) نے ان کو ادب میں منفرد مقام عطا کیا ہے۔ اس گوشے میں ڈاکٹر محمد محسن خان، محبوب انور، اسلم جمشید پوری، شاہد اختر، فیروز عابد، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر دبیر احمد، انیس رفیع کے مضامین ڈاکٹر مشاق اعظمی کی ادبی خدمات کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر اعزاز افضل، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، نذیر احمد یوسفی، رونق نعیم، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر عابد ضمیر، ندیم شعبانی اور احسان ثاقب کی آرا مشاق اعظمی کی ادبی سرگرمیوں کو اعتبار بخشتی ہیں۔ مشاق اعظمی کی بیٹی سیمیں رخسار نے ہند و پاک کے چند ادیب و نقاد کے خطوط کو جمع کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اردو دنیا کے معتبر ادیبوں سے ان کے والد کے رابطے مستحکم تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر انور سدید، ضیاء اللّٰہ کھوکھر اور پروفیسر غازی علم الدین (مرحوم) کے نام بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر مشاق اعظمی کی افسانہ نگاری پر اس میں شامل مضامین میں تخلیق کار کے ادبی مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشاق اعظمی کے دو افسانے 'فیوز' اور 'نارسیدہ' بھی اس میں شامل ہیں۔ افسانہ 'نارسیدہ' پر انیس رفیع کا تجزیاتی و تنقیدی مضمون قابل توجہ ہے۔ ڈاکٹر دبیر احمد (کولکاتا) اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مشاق اعظمی کے ہاں المیہ احساس ایک خاص شدت اور وقار کے ساتھ سامنے آتا ہے، جو نہ تو جذباتی شور میں ڈھلتا ہے، نہ ہی محض ادبی سجاوٹ بن کر رہ جاتا ہے، ایک داخلی سکوت کے ساتھ قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔''

اسلم جمشید پوری نے لکھا ہے:

''سن ستّر کے بعد اردو افسانے کی دنیا میں جو نئی نسل سامنے آئی، اس میں مشاق اعظمی کا شمار ایک معتبر اور نمایاں نام کے طور پر کیا جاتا ہے۔ یہی وہ نسل ہے جس نے افسانے کو تجریدی خلا سے نکال کر زندگی کی زمینی حقیقتوں سے جوڑا۔''

محبوب انور لکھتے ہیں کہ ''ان کی (مشاق اعظمی) تخلیقی کائنات اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو متحرک، حساس اور دائمی

بنانے میں اپنی پوری توانائی اور قوت لگادی ہے۔''

خصوصی گوشہ میں شامل چند مضامین کے یہاں اس لیے اقتباس نقل کیے گئے کہ مشتاق اعظمی کے تخلیقی وژن کا ادراک کیا جاسکے۔ واضح ہو کہ مشتاق اعظمی کا ایک افسانہ 'کلائمکس' کے عنوان سے 1964 کے ماہنامہ بیسویں صدی، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ گویا ان کا افسانوی سفر کم سے کم 50 برسوں کو محیط ہے۔ ان کے دوسرے افسانوی مجموعہ 'نارسیدہ' (اشاعت 2012) میں ایک افسانہ 'شب تشنہ لبی' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہی افسانہ عنوان بدل کر دوماہی گلبن (شمارہ جنوری تا اپریل 2016) میں بھاگلپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے اپنے نام سے شائع کرایا جس کا عنوان ہے 'کیا میں چوہیا ہوں'۔ یہ پروفیسر صاحب اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کے بارے میں بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کے نام سے شائع شدہ ایک سو سے زائد کتابوں پر بھی سوالیہ نشان قائم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جاسوسی ادب کے معمار ابن صفی پر یہ خاکسار گزشتہ دو ہزار عیسوی سے باضابطہ کام کر رہا ہے۔ میری ایک ضخیم کتاب 'ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ' دسمبر 2013 میں شائع ہوئی تھی۔ ایک سال قبل ہی (نومبر 2012 میں) جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبہ اردو اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے یونیورسٹی کی سطح پر پہلی بار ڈاکٹر خالد محمود کی سرپرستی میں تین روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس کا افتتاح اُس وقت کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ نے کیا تھا۔ ابن صفی کی ادبی خدمات کے حوالے سے میری کتاب کی اشاعت کے معاً بعد 2013 میں پروفیسر موصوف کی تین کتابیں شائع شائع ہوئیں جن میں ایک کتاب کا نام ہے 'ابن صفی کے 101 اداریے: جائزہ'۔ اس کتاب کے بارے میں راقم کو خود برادر قسیم اختر نے بتایا تھا کہ وہ کتاب خود ان کی تیار کی ہوئی تھی جسے پروفیسر موصوف نے اپنے نام سے شائع کرایا۔ قسیم اختر صاحب اس وقت کٹیہار (بہار) کے ایک کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ اس بات کی تصدیق ماجد اقبال (کولکاتا) کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو دوماہی گلبن (لکھنؤ) کے شمارہ جنوری تا اپریل 2017 میں شائع ہوا تھا۔ اپنے خط میں ماجد اقبال لکھتے ہیں: ''مناظر عاشق کی کتاب 'ابن صفی کے ایک سو ایک اداریے' کا مسودہ ان کے ایک مداح قسیم اختر نے تیار کیا تھا۔ نوک پلک درست (ایڈیٹنگ) کرنے کے لیے مناظر صاحب کو دیا گیا تو وہ ان کے نام سے چھپ گئی۔''

اسی طرح مظفر آباد کے معروف ادیب اور ماہر لسانیات پروفیسر غازی علم الدین صاحب کی کتاب 'لسانی مطالعے' سے جس طرح 'لسانی لغت' کتاب مناظر صاحب نے تیار کر کے اپنے نام سے چھپوائی تھی، اس کی حقیقت سے اردو دنیا اب خوب واقف ہے۔

جب کسی ادیب اور پروفیسر کا ادبی و علمی کردار مشکوک ہو جائے اور ادب کی دنیا میں ادبی دیانت داری مجروح ہونے لگے تو ممکن ہے کہ ادبی دنیا مجرمانہ خاموشی اختیار کر لے تو ایسی صورت میں اس کے معاملات خدا کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن ادب کی دنیا میں سرقہ کے مرتکب کسی ادیب یا نقاد و محقق کے نام پر ایوارڈ و اعزاز عطا کرنے سے خود محبان اردو کا کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔

جہاں تک مشتاق اعظمی کے افسانے کا تعلق ہے، یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ نہ صرف وہ ایک اوریجنل تخلیق کار ہیں بلکہ ان کا افسانہ اس لائق ہے کہ کوئی پروفیسر اسے اپنے نام سے من و عن شائع کرا دے۔ 'ادبی سرقہ' کے مرتکبین درجنوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے ایک صاحب جن کا انتقال ہو چکا ہے، انہوں نے پاکستان کے معروف محقق عطش درانی کی ایک کتاب خود اپنے نام سے شائع کر لی تھی۔ اس کی تفصیلات بیس سال قبل 'اردو بک ریویو' کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

❑❑❑

اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات

(ترمیم و اضافے کے ساتھ)

مصنف: ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

ISBN 978-93-90579-98-3

صفحات:224، قیمت:-/300، اشاعت:2023

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ فون:011-44753890

گُل افشانیاں (طنزومزاح)

مصنف: ڈاکٹر فرزانہ فرح

(Mobile: 9886571233)

تبصرہ: مجتبیٰ انجم☆

ادب کی رنگا رنگ اصناف میں ایک ماہرِ قلم کار اپنے الفاظ کے ذریعے ایسے جیتے جاگتے نقش ابھارتا ہے، جو قاری کے تصور کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ اسے بصیرت کے نئے جہانوں سے روشناس کراتا ہے۔ شاعری جہاں اپنے جذباتی تلاطم سے کبھی رلاتی اور کبھی مسحور کرتی ہے، وہیں نثری تخلیقات میں 'طنز و مزاح' ایک ایسا کٹھن فن ہے جو مسکراہٹوں کے پیرائے میں بیداریِ شعور کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ جب ظرافت میں فکر کی یہ گہرائی شامل ہو جائے، تو وہ محض تفریح نہیں رہتی بلکہ بلند پایہ ادب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

گزشتہ ربع صدی کے دوران میدانِ طنز و ظرافت میں جن معدودے چند خواتین نے اپنی تخلیقی زرخیزی اور ہنرمندی سے انفرادی شناخت قائم کی ہے، ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر فرزانہ فرح کا ہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ملک و بیرونِ ملک کے موقر جرائد، بالخصوص اردو طنز و مزاح کے نمائندہ رسالے 'شگوفہ' (حیدرآباد) میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ گل افشانیاں ڈاکٹر فرزانہ فرح کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے؛ اس سے قبل ان کے دو مجموعے 'شوخیِ تحریر' (2016) اور 'دیکھنا تحریر کی لذت' منظرِ عام پر آ کر شائقینِ طنز و مزاح سے بھرپور داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

مدیرِ 'شگوفہ' جناب مصطفیٰ کمال کے نام معنون، زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر فرزانہ فرح کے چودہ شگفتہ مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں 'من خوب می شناسم' کے عنوان سے ان کی مختصر آپ بیتی

صفحات: 144 قیمت:-/275 اشاعت:2024

ISBN 978-93-6062-286-2

ناشر: محبانِ اردو گلبرگہ، تنظیم برائے فروغِ اردو زبان و ادب، مسلم چوک، گلبرگہ-585104 (کرناٹک)

بھی شامل ہے۔ طنز و مزاح سے اپنی دلی وابستگی کا اظہار انہوں نے 'اقرار' کے عنوان سے اپنے پیش لفظ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''میرے لیے طنز و مزاح دراصل تسکینِ خاطر کی وہ منتخب راہ ہے، جہاں دریائے زیست کے مدوجزر کا پرتو، براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔''

جناب مصطفیٰ کمال اپنے مضمون 'حروفِ اخلاص' میں رقم طراز ہیں کہ اکیسویں صدی، اور بالخصوص کووڈ کے عہد میں اردو طنز و مزاح کی روایت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ ایسے نامساعد حالات میں فرزانہ فرح نے اپنی شگفتہ تحریروں سے نہ صرف قارئین کے مشامِ جاں کو مہکایا بلکہ طنز و مزاح کے علَم کو بلند رکھنے میں بھی اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔

'گل افشانیاں' میں شامل مضامین ڈاکٹر فرزانہ فرح کی فنی پختگی اور اسلوب کی ندرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان تحریروں میں جہاں زندگی کی تلخ سچائیاں موجود ہیں، وہیں بیان کی شگفتگی قاری کو اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔ ان مضامین کے موضوعات اگرچہ ہماری روزمرہ زندگی سے ماخوذ بظاہر سادہ نظر آتے ہیں، لیکن مصنفہ ان کے تانے بانے کچھ اس مہارت سے بنتی ہیں کہ ان میں گرد و پیش کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی واقعات سے لے کر بدلتی ہوئی اقدار تک کے تمام رنگ سمٹ آتے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'ٹماٹر کی ٹرٹر' بڑھتی ہوئی مہنگائی کے موضوع پر ایک شاہکار تخلیق ہے۔ ٹماٹر کو ایک متحرک علامت بنا کر مصنفہ نے معاشی ناہمواریوں پر جس مہارت سے قلم اٹھایا ہے، اس سے قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بے جان سبزی خود زبانِ حال سے معاشرے کے استحصالی رویوں کا نوحہ پڑھ رہی ہو۔ یہ مضمون مزاح کے پیراہن میں طنز کی ایک کڑوی سچائی ہے۔ 'تم کو معلوم ہے کووڈ کی حقیقت لیکن' میں کووڈ جیسی قیامت خیز وَبا اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی و معاشی ابتری کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ڈاکٹر فرزانہ فرح نے نہ صرف لاک ڈاؤن کی صعوبتوں کا احاطہ کیا ہے، بلکہ 'آن لائن تعلیمی نظام' کی صورت میں رونما ہونے والی مضحکہ خیز تبدیلیوں پر بھی بھرپور نشتر چلائے ہیں، جنہیں پڑھ کر ہر متاثرہ شخص اسے اپنے دل کی آواز محسوس

کرتا ہے۔'دھن کی بات' ملک میں اچانک نافذ ہونے والی نوٹ بندی کے بعد کی صورتحال کی بھر پور عکاسی کرتا ہے۔نوٹ بندی نے جہاں عام آدمی کو قطاروں میں لاکھڑا کیا، وہیں طبقہِ اشرافیہ کی عیاشیاں برقرار رہیں۔مصنفہ نے اس سنگین فیصلے کے سماجی اثرات اور منسوخ شدہ نوٹوں کی بے وقعتی کو ایسے دلنشیں اور شگفتہ اسلوب میں بیان کیا ہے کہ قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔' آن لائن مشاعرے' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون ڈیجیٹل دور میں ادب کے بدلتے رنگوں، خود ساختہ شعراء کی بہتات، تکنیکی خرابیوں اور ادبی زوال کی ایک ایسی مزاحیہ دستاویز ہے جس سے ہر باذوق ادیب اتفاق کرے گا۔

اسی طرح 'ٹیرفک ٹرافک' میں شہری زندگی کے سنگین ٹریفک مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے، جبکہ 'سیل کا کھیل' خواتین کی ڈسکاؤنٹ سیل سے گہری دلچسپی کا ایک پُرمزاح مرقع ہے۔

ڈاکٹر فرزانہ فرح کا ایک اور توانا تخلیقی حوالہ ان کی شاعری بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں بھی شاعرانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔موزوں تمثیلیں، بلیغ تشبیہیں اور مشہور زمانہ اشعار کی دلچسپ و برجستہ تضمینیں ان کے مضامین کی معنوی جاذبیت اور کیف و اثر میں بھرپور اضافہ کرتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 'گل افشانیاں' اردو طنز و مزاح کے افسردہ چہرے پر ایک شگفتہ تبسم کی مانند ہے۔ڈاکٹر فرزانہ فرح نے سماجی ناہمواریوں کو ظرافت کے پیرائے میں جس مہارت سے پیش کیا ہے، وہ انہیں عصر حاضر کے اہم مزاح نگاروں کی صف میں ممتاز کرتا ہے۔بلاشبہ یہ کتاب طنز و ظرافت کے خزینے میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: طیب نگر، گیورائی، تعلقہ گیورائی،
ضلع بیڑ-431127 (مہاراشٹر) موبائل: 7218418460

□□□

گوشت خوری سے گلابی انقلاب تک

مصنف: ڈاکٹر عبدالسمیع صوفی

صفحات: 208 قیمت: -/150 روپے

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔۲

نقوشِ پندار

(منتخب علمی، ادبی و تجزیاتی مضامین)

مصنفہ: شمع اختر کاظمی

تبصرہ: ابراہیم افسر☆

زیر تبصرہ کتاب 'نقوشِ پندار' شمع اختر کاظمی کے علمی، ادبی و تجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کی کتابیں 'آدھی دنیا'، 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' اور 'سورج سوا نیزے پر' منظرِ عام پر آ کر ناقدین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔موصوفہ امورِ خانہ داری کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے ادب تخلیق کر رہی ہیں۔ موصوفہ جو کچھ لکھتی ہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھتی ہیں اور قارئین ان کی باتوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔انہوں نے 'نقوشِ پندار' کے پیش لفظ 'یہ بزمِ اُردو ہے صاحبو!' میں اُردو زبان کی صورتِ حال پر اظہار خیال کیا ہے۔اس 'پیش لفظ' کو پڑھ کر اُردو کے عاشق غور و فکر کرنے پر مجبور ہوں گے۔دورِ حاضر میں اس زبان کو جس مشکوک انداز اور ترچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کا تدارک مع مثال موصوفہ نے اپنے پیش لفظ میں کر دیا ہے۔انہوں نے اُردو زبان کو ہندوستان کی شیریں اور رابطے کی زبان قرار دیا ہے۔

شمع اختر کاظمی نے 'نقوشِ پندار' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا حصہ نثر پر اور دوسرا حصہ شاعری پر مشتمل ہے۔حصۂ نثر میں موصوفہ نے اُردو ادب کے نامور صحافیوں، افسانہ نگاروں، مدیرانِ رسائل و جرائد اور اساتذہ کی گراں قدر ادبی جہات کو اجاگر کیا ہے۔جن قابلِ اعتماد نثر نگاروں کو انہوں نے اپنی تنقید کے لیے منتخب کیا ان میں حقانی القاسمی، منظر کاظمی، سید احمد قادری، شمیم طارق، شبیر احمد، محمود ایوبی، عالم نقوی، افتخار امام صدیقی، اسلم جمشید پوری، امام اعظم، سید محمد نور الحسن نور نوابی،

صفحات: 264 قیمت: -/300 اشاعت: 2025
ISBN 978-93-95194-56-3
ناشر: صائمہ ایڈورٹائزرس، بھیونڈی-421302 (مہاراشٹر)
Mobile: 9284690949

شاکرادیبی، شام رضوی، واجدہ تبسم اور شہناز شازی قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری کے باب میں شمع اختر کاظمی نے بھیونڈی کے مرحومین شعرائے کرام اور ان کا مجموعۂ کلام کا تعارفی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ان شعرا میں ایواب فہمی، ایوب صابر، بسمل پرتاپ گڑھی، بشیر نظر، ظریف نظام پوری، ظفر الاسلام ظفر، عبدالخالق غیرت انصاری، عمر شفق، عرشی جون پوری، عبدالکریم خفی، عبدالرحیم بی اے، عارف حسنین عارف، عبدالعزیز اشرفی، فیضی نظام پوری، قمر پرتاپ گڑھی، راشد الہ آبادی، راز پرتاپ گڑھی، زیڈ عابد شہابی، شبیر احمد راہی، محسن امیدی برہان پوری، منظر اعظمی، معصوم انصاری، وارث مؤ آئمی اور یوسف حسن مومن اہمیت کے حامل ہیں۔

شمع اختر کاظمی نے حقانی القاسمی کے ادبی فکر وفن پر لکھا کہ وہ علم وآ گہی کی عصری خانقاہوں کے بوریہ نشیں درویش ہیں۔ حقانی القاسمی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے صحافت کے میدان میں خاطر خواہ کام کیا اور ادبی رسائل کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔انہوں نے مشرقی تنقید کو اوڑھنا اور بچھونا بنایا ہوا ہے۔موصوف نے فن پارے کی جمالیات کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ مذکورہ باتوں کا محاکمہ شمع اختر کاظمی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ بلا شبہ دورِ حاضر میں حقانی القاسمی نے اپنی تنقیدی وتخلیقی تحریروں سے ادب میں ایک خاص مقام بنایا ہے۔

شمع اختر کاظمی نے مشہور افسانہ نگار سید احمد قادری کے بارے میں لکھا کہ موصوف ایسے فن کار ہیں جن کا ادبی سفر کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ان کی نثر میں کشش ہے، افسانوں میں کہانی پن ہے۔شمع صاحبہ نے سید احمد قادری کے افسانوی مجموعوں ریزہ ریزہ خواب، دھوپ کی چادر، پانی پر نشاں ملبہ کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔انہوں نے اپنے تجزیاتی مطالعے میں قادری صاحب کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع اور تخیلی بصیرت پر اظہار خیال کیا ہے۔ان کی نظر میں سید احمد قادری کا شمار اُردو افسانے کی تیسری آواز میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔انہوں نے یہ بھی لکھا کہ جدیدیت اور تجریدی وعلامتی افسانوں کے طوفان میں بھی قادری صاحب نے اُردو افسانے کی لاج رکھی۔

شمیم طارق اُردو ادب میں قلندر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انوکھے اور منفرد مضامین وکالموں سے عوام وخواص کو متاثر کیا ہے۔ان کی تحریروں میں تنقید وتحقیق ساتھ ساتھ چلتی ہے۔حالاں کہ ان کے حاسدین وناقدین کا ایک گروہ ان پر طرح طرح کے الزامات بھی لگاتا ہے۔ان تمام باتوں کے باوصف شمیم صاحب' نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا' کے مصداق اپنے ادبی مشن میں رات دن لگے ہوئے ہیں۔شمع اختر کاظمی نے شمیم طارق کے کالمز، تنقید، تحقیق، شاعری وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ان کی نظر میں شمیم طارق ایک فعال ادیب ومقرر اور شاعر ہیں۔اپنے مضمون میں موصوفہ نے شمیم صاحب کی کسی تخلیق یا ترتیب کردہ متن پر کوئی ناقدانہ گفتگو نہیں کی ہے۔ ان کا یہ مضمون یادداشتوں اور ملاقاتوں پر مبنی ہے۔

شمع اختر کاظمی نے پروفیسر اسلم جمشید پوری کے افسانوی جہان کو مذہبی وادبی وجدان اور رنگِ حلاوت سے موسوم کیا۔ دراصل شمع اختر کاظمی نے اسلم صاحب کے افسانوی مجموعے 'شکوہ جواب شکوہ' کا تجزیہ اپنے مضمون میں کیا ہے۔'شکوہ جواب شکوہ' میں اسلم جمشید پوری نے قرآنی قصوں اور اسلامی واقعات کو افسانوی قالب میں پیش کیا ہے۔اپنے مضمون میں موصوفہ نے 'شکوہ جواب شکوہ' کے بہت سے اقتباس بہ طور حوالہ ونمونہ شامل کیے جن میں آسمانی کتابوں اور اسلامی تعلیمات کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مضمون کے آخر میں موصوفہ نے 'شکوہ اور جواب شکوہ' کے بارے میں لکھا کہ آنے والے زمانے میں ان افسانوں پر مزید گفتگو کی گنجایش نئی نسل کے ہاتھ میں ہوگی۔

شمع اختر کاظمی نے کتاب کے دوسرے حصے' حکم ہے چند ہی لفظوں میں ہوا اظہارِ وفا' میں شہر بھیونڈی کی تاریخ، تہذیب وتمدن پر تحقیقی وتنقیدی گفتگو کی ہے۔انہوں نے اس شہر کی ادبی تاریخ کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا کہ 1949 میں اس شہر میں کل ہند ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس ہوئی۔ یہاں پر شعرا وادبا کی ایک جماعت نے اُردو کے پرچم کو بلند کیا۔موصوفہ نے شہر بھیونڈی سے تعلق رکھنے والے مرحوم شعرا کے ادبی مقام ومرتبے کے علاوہ ان کی شعری کائنات کو قارئین کے سامنے کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔اس طرح کتاب کو دوسرا حصہ ایک شعری

تذکرے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔شمع اختر کاظمی نے ایوب فہمی کی شعر گوئی پر بات کرتے ہوئے لکھا کہ وہ ایک ایسے تخلیق کار رہے جنھوں نے شاعری میں فرسودہ روایات کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ نئے اصولوں کے رہنما بنے، پرانے بت گرائے اور نئے بتوں کو ادب کے مندر میں سجایا۔ انہوں نے مثال کے لیے ایوب فہمی کے متعدد اشعار کا انتخاب اپنے مضمون میں کیا۔

شمع اختر کاظمی نے بسمل پرتاپ گڑھی کے بارے میں لکھا کہ وہ لفظیات کو تازہ کاری کے ساتھ برتنے کا ہنر جانتے تھے۔بسمل پرتاپ گڑھی نے اپنی غزل گوئی کا آغاز 1962 میں کیا۔انہوں نے جدید لب و لہجے کو اپنی نشاعری کے لیے مختص کیا۔بسمل پرتاپ گڑھی نے اپنے شعری مجموعے 'آبِ رواں' میں اپنی غزلوں کا انتخاب شامل کیا ہے۔نمونے کے طور پر ان کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

تقسیم کر رہے تھے سب آپس میں خوفِ جنگ
ہر شخص کی زبان اگلتی رہی دعا

عمر شفق شہر بھیونڈی کی شعری محفلوں کی آبرو تھے۔انہوں نے اپنے شعری مشق، راست بیانی، صاف و شگفتہ لہجے اور مخصوص طرزِ ادا کی بنا پر بھیونڈی کی ادبی محفلوں کو جلا بخشی۔عمر شفق کے بارے میں شمع اختر کاظمی نے لکھا ہے کہ وہ سب سے نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔انہوں نے 1940 میں بھیونڈی میں 'بزم سخن' کی بنیاد ڈالی۔ان کا شعری مجموعہ 'رنگِ شفق' 2003 میں شائع ہوا۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں عمر شفق نے اپنے مشاہدے و تجربے کو پیش کیا ہے:

سورج نے جب سمیٹ لیا دھوپ کو
میرا ہی سایہ سایۂ دیوار ہو گیا

کھلونوں کی دکانیں، جیب خالی، ساتھ میں بچّے
گزرنا بھی اُدھر سے ہے جدھر بازار ہے بھائی

بہرکیف! شمع اختر کاظمی نے زیر نظر کتاب میں مرحومین شعرا کے ساتھ تادمِ تحریر حیات افسانہ نگاروں کے کارناموں کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔موصوفہ نے اپنے مضامین میں نہ کسی کی بے جا تعریف کی اور نہ بیجا تنقید۔انہوں نے اعتدال کے ساتھ تمام ادبا و شعرا کا تجزیہ کیا۔حالاں کہ ہم سبھی کو اپنے وطن کے شعرا و ادبا سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔اس کے باوجود شمع اختر کاظمی نے اپنی تنقیدی و تجزیاتی تحریروں کو متن تک محدود کیا۔البتہ وہ کئی ادبی شخصیات سے مرعوب بھی نظر آئیں لیکن انہوں نے تعریفی تنقید سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔اس موقع پر یہ عرض کرنا لازمی ہے کہ شمع اختر کاظمی نے حصۂ نثر کی فہرست صفحہ چار پر اور حصہ شاعری کی فہرست صفحہ 140 پر درج کیا ہے۔اگر فہرست ایک ساتھ ہوتی تو مضائقہ نہیں ہوتا۔نثری حصے پر رفیق جعفر اور شعری حصے پر محمد رفیع انصاری نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔کتاب کی پشت پر موصوفہ کی گزشتہ کتابوں پر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور محمد وجیہ الدین کی آرا درج ہیں۔کتاب کو موصوفہ نے اپنے شوہر نام دار اختر کاظمی کو معنون کیا ہے۔سرورق بہت ہی جاذب اور قیمت مناسب ہے۔امید قوی ہے کہ شمع اختر کاظمی کی یہ کتاب ان کی گزشتہ کتابوں کی طرح ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی۔

☆ مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ– 250501 (یوپی) موبائل 9897012528

□□□

شکیل الرحمٰن کے افسانے

(کتابی سلسلہ ادراک، گوپال پور)

ترتیب و پیشکش: پروفیسر سیّد حسن عباس

تبصرہ: ریاض احمد قادری☆

پروفیسر شکیل الرحمن (مرحوم) اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔وہ ایک صاحب طرز ادیب، معتبر نقاد، طرح دار انشا پرداز، عمدہ سفر نامہ نویس اور ناول و افسانہ نگار تھے۔موصوف کے نثر پاروں میں جمالیاتی حسن کا تنوع اور بوقلمونی جس

صفحات: 328 قیمت:-/300 اشاعت:2018 تا2024
ISSN 2454-5260
ناشر: مرکز تحقیقاتِ اردو و فارسی، گوپال پور، باقر گنج، سیوان-842186 (بہار) Mobile: 9839337979

طرفگی اور بانکپن کے ساتھ موجود ہے اس کی مثال اردو ادب میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اہل فن نے پروفیسر شکیل الرحمن کی تحریروں کے جس پہلو کو سب سے زیادہ سراہا وہ ان کا جمالیاتی ذوق ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اردو تنقید کا جمالیاتی دبستان بلا شرکتِ غیر آج شکیل الرحمن کے نام سے منسوب ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن کی ابتدا تنقید نگاری سے ہوئی۔ تنقید و تنقیح کے تعلق سے ان کے تحریر کردہ مضامین کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی اولین تنقیدی کتاب 'ادب اور نفسیات' اس وقت منظر عام پر آ گئی تھی جب وہ پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ ایک متعلم کی اس کتاب کو پڑھ کر مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین نے لکھا تھا: ''ایک نوعمر نقاد کی یہ ابتدا بے حد امید افزا ہے''۔ ان کے دوسرے تنقیدی مجموعہ 'شعور اور تنقیدی شعور' (مطبوعہ 1957) کی اشاعت کے بعد اردو ادب کے نقادوں میں ان کا شمار ہونے لگا، لیکن سچ یہ ہے کہ انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ پروفیسر شکیل الرحمن کی محنت و کاوش سے اردو تنقید ایک نئی جمالیاتی جہت سے آشنا ہوئی اور اسے ایک نیا زاویہ ملا۔ ان کی تنقیدی تحریر کہیں کہیں غیر واضح اور مغلق ہونے کے باوجود ان کا دلکش اسلوبِ تحریر قاری کو اکتاہٹ یا بوجھل پن کا احساس نہیں دلاتا بلکہ ان کا جاذب اسلوب اور دلکش طرز تحریر قاری کو مزید مطالعہ کے لیے اکساتا اور مہمیز کرتا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن کا یہ جملہ اردو ادب کی دنیا میں بہت مشہور ہوا تھا کہ ''غالب دنیا کے سب سے بڑے شاعر اور منٹو دنیا کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں''۔ پروفیسر شکیل الرحمن کی حضرت امیر خسروؒ، مرزا اسداللہ خان غالب، (مولانا) ابو الکلام آزاد، فیض احمد فیض، اختر الایمان اور سعادت حسن منٹو سے متعلق تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری یقیناً اپنے علم میں اضافہ محسوس کرتا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمن نے تنقید کے ساتھ اپنے سبک رو قلم سے افسانہ نگاری کے کینوس پر بھی بڑی حسین قلم کاری و رنگسازی کی اور خوب گل بوٹے کھلائے۔ ان کے لکھنے کا دلکش اسلوب، ان کی رومانوی فکر، زبان و بیان پر ان کی دسترس، ان کا دلنشین انداز تحریر، مناظر قدرت کی حسین عکس بندی، ان کا جمالیاتی ذوق اور تعبیرات ولفظیات کا حسین استعمال، یہ سب ایسے عوامل ہیں جن کی بنا پر ان کے افسانے ادب نواز طبقہ سے خاص توجہ کا تقاضا کرتے تھے۔ پروفیسر کوثر مظہری کے قول کے مطابق پروفیسر شکیل الرحمن کا پہلا افسانہ 'طوفان' کے عنوان سے ماہنامہ 'نظام' دہلی میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ان کے بیشتر افسانے 'بیسویں صدی' کے صفحات کی زینت بنے۔ شمع افروز زیدی کے بقول ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی کے شمارہ ستمبر 1955 میں پہلی بار اُن کا افسانہ 'ڈائری کی محبوبہ' شائع ہوا، پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ شکیل الرحمن کے کل افسانوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہوسکی ہے، کسی نے 34 کہا تو کسی نے 36 بتلایا، اور کسی نے اس سے بھی زیادہ کا اشارہ دیا، اللہ جانے صحیح تعداد کیا ہے۔ ان کے افسانے 'بیسویں صدی' میں وقفہ وقفہ سے شائع ہوتے رہے۔ مختلف شماروں میں منتشر ان کے رومانی افسانوں کے شائقین کی رسائی 'بیسویں صدی' کے اوراقِ پارینہ تک ممکن نہیں تھی، اس لیے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان کے بکھرے ہوئے ادبی شہ پاروں کو یکجا شائع کردیا جائے۔ گوپال پور (سیوان، بہار) کے ادبی مجلہ 'ادراک' نے اپنے کتابی سلسلہ کی خصوصی اشاعت (2018 تا 2024) کو پروفیسر شکیل الرحمن کے افسانوں کے لیے وقف کردیا، اور اس مجلہ کے مدیر اعزازی پروفیسر سید حسن عباس نے بڑی محنت و جستجو کے بعد ان کی 34 تخلیقات کو یکجا کرکے شائع کیا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں تدریس کا فریضہ انجام دینے والے پروفیسر سید حسن عباس ایک خوش بیان وخوش کلام شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ایک نہایت شفیق معلم، نامور مصنف، معتبر محقق اور کامیاب مترجم ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے احوال و آثار، ذکرِ نادم بلخی، ، رضا لائبریری کی علمی وراثت، ارمغانِ علمی؛ نذرِ پروفیسر حنیف نقوی وغیرہ ان کے یادگار علمی کارنامے ہیں جن کے مطالعہ سے اردو ادب کے طالب علم اپنے علم کو وسیع کرسکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے مجلہ ادراک کی اس خصوصی اشاعت کو بشکل کتاب ظاہر و باطن ہر اعتبار سے بہت حسین وجمیل شکل میں پیش کیا ہے۔ مزید برآں اپنے پیش نامہ میں اس مجموعہ کے سارے افسانوں کا اختصار نامہ یا خلاصہ بھی

تحریر فرمایا ہے۔اسے پڑھ کر پروفیسر سید حسن عباس کی کاوش کو نہ سراہنا اوران کی محنت وجستجو کی داد نہ دینا اورآفرین کے کلمات نہ لکھنا یقیناً ناانصافی کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ اس اشاعتی سلسلہ کو دوبارہ شروع کرنے پر میں محترم پروفیسر سید حسن عباس کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، اورامید کرتا ہوں کہ ان کی سرپرستی میں یہ کتابی سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔ ادارہ مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور (سیوان ، بہار) کے ارکان کی خوش انتظامی اوران کی ہمت وجرأت کی بھی میں ستائش کرتا ہوں کہ اس کساد بازاری اور بے اعتنائی کے دَور میں، جب اردو داں طبقہ اپنے ہاتھوں کانٹے بو رہا ہے، انہوں نے عزم وہمت کے ساتھ اس گراں مایہ اشاعتی سلسلے کا اجرا کیا ہے۔ میں اردوادب کے شائقین سے ملتمس ہوں کہ اس ضخیم مجلہ کو خرید کر ادارہ کا تعاون کریں۔ قیمت 300 روپے زیادہ نہیں ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: J-31/78 کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316 - 7905661199

❑❑❑

کوچۂ عزیزان (خاکے)

مصنف: ڈاکٹر انیس صدیقی

تبصرہ: محمد عارف اقبال

محقق وادیب اوراردو کے لائق وفائق استاذ (موظف) ڈاکٹر انیس صدیقی (پ: 27 جنوری 1963) کرناٹک کے شاہ پور ضلع یادگیر میں پیدا ہوئے۔ شاہ پور میں ابتدائی تعلیم کے بعد بود و باش اور اعلیٰ تعلیم و ملازمت کے اعتبار سے عملاً گلبرگہ کے ہوکر رہ گئے۔ یہ کہنا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ گلبرگہ اب ان کا 'وطن ثانی' ہے۔گلبرگہ کی فضا ایسی راس آئی کہ ان کی کئی کتابوں کا موضوع گلبرگہ ہی رہا۔حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ

صفحات: 140 (مجلد)، قیمت: -/300، اشاعت: 2025
ISBN 978-93-6062-001-1
ناشر: محبانِ اردو، نزد مسجد صالحین، مسلم چوک،
گلبرگہ-585104 (کرناٹک) موبائل: 9342353312

گلبرگہ کی ذمہ داری کے ساتھ گلبرگہ کے محبانِ اردو کی تنظیم برائے فروغ اردوزبان وادب کے معتمد بن گئے۔ایسی صورت میں گلبرگہ کی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ وہ سماجی وثقافتی سرگرمیوں سے اعراض نہیں کرسکتے تھے۔لہٰذا انیس صدیقی کے چاہنے والوں کا تعلق گلبرگہ کے ہر طبقے سے ہے۔ انہوں نے گلبرگہ کے جدید قلم کاروں پر قلم اٹھایا، وہاں کے شعروادب پر دادو تحسین کے کلمات نچھاور کیے۔ 2024 میں 'گلبرگہ کے ادب ساز' بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکے۔ 2025 میں 'کوچہ عزیزاں' کے نام پر جن 14 شخصیات کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا ہے، ان میں بیشتر کا تعلق گلبرگہ سے ہے۔ البتہ جن پانچ شخصیات کے خاکے اس میں شامل ہیں وہ صوبہ کرناٹک کے دیگر شہروں میں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر انیس صدیقی نے 'کرناٹک میں اردوصحافت' پر اپنی پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔اس تحقیقی کام کے دوران میں ان کی ملاقات موجودہ دور کے معروف صحافی اور دانشور محمد اعظم شاہد سے بنگلور میں ہوئی تھی۔ اعظم شاہد پر لکھے خاکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ معاشیات کے لکچرر ہوئے، اس وقت بھی اردوصحافت سے ان کا تعلق مستحکم تھا۔ان کی تحریریں مقبول عام اخبار سالار (بنگلور) میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ 2020 میں اپنی 38 سالہ ملازمت سے باضابطہ سبکدوش ہونے کے بعد ان کی اولین ترجیح صحافت ہی ہے۔ اعظم شاہد ہمہ جہت شخصیت کے حامل ایک بردبار اور بے ریا انسان ہیں۔انیس صدیقی نے ان کا قلمی خاکہ بڑی مہارت سے تخلیق کیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے اپنی اس شرمندگی کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان کی کتاب 'کرناٹک میں اردوصحافت' میں کرناٹک کے ممتاز صحافیوں کے باب میں نادانستہ طور پر اعظم شاہد کا نام شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اعظم شاہد نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زبان سے ایک حرف شکایت نہیں نکالا۔ اس سہو کے لیے انیس صدیقی کو آج بھی بے حد قلق ہے۔ تاہم اپنے خاکے میں انہوں نے اعظم شاہد کے خلوت وجلوت کے محاسن کا بڑی چابکدستی کے ساتھ ذکر کرکے اپنے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر انیس صدیقی اپنی علمی وادبی سرگرمیوں میں ڈاکٹر شمس

الرحمٰن فاروقی کے 'شب خون' کا توضیحی اشاریہ (دوجلدوں میں) تیار کر کے بڑا اہم فریضہ انجام دیا تھا۔ 2017 میں دونوں جلدیں شائع ہوئیں۔ کووڈ 19 کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) نے بھی دونوں جلدوں کو شائع کر دیا ہے۔ 2016 میں انیس صدیقی کی ایک کتاب 'خاکہ نگاری: اردو ادب میں' شائع ہوئی تھی۔ گویا شخصیات کے خاکے آنے سے قبل خاکہ نگاری پر ایک سنجیدہ ادبی کام دس برس قبل ہی وہ انجام دے چکے تھے۔ اس لحاظ سے توقع ہے کہ خاکوں کا مجموعہ 'کوچہ عزیزاں' میں یقینی طور پر انہوں نے خاکہ نگاری کے آداب کا خیال رکھا ہوگا۔

'کوچہ عزیزاں' میں جن 14 شخصیات کے خاکے شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی ترتیب کے لحاظ سے اس طرح ہیں: حضرت سیّد شاہ خسرو حسینی (حضرت خواجہ دکن سیدنا بندہ نواز گیسو درازؒ کے 23ویں سجادہ نشین)، محمد اعظم اثر، وہاب عندلیب، حامد اکمل، مسعود عبدالخالق، ناظم خلیلی، محمد اعظم شاہد، میر شاہنواز شاہین، خواجہ پاشاہ، انعام دار، اکرم نقاش، فرزانہ فرح، داوّد محسن، منظور وقار اور چاند اکبر۔

ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ خاکہ نگار نے چند صفحات میں ہر شخصیت کا مکمل تعارف پیش کر دیا ہے۔ شاید ہی کسی خاکے میں تشنگی کا احساس ہوتا ہو۔ ادب میں خاکہ کا تعلق جس صنف سے ہے اس میں طنز و مزاح کا پہلو بھی اہم ہوتا ہے۔ ان کے کئی خاکوں میں طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے لیکن خاکہ نگار خود لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک شخصیتوں کے وقار اور حرمت کا پاس مقدم ہے۔ اس لیے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''ان تحریروں کے 'خاکہ' کہلانے پر اصرارِ بے جا بھی نہیں ہے۔'' چلئے اب تو معاملہ صاف ہی نہیں بلکہ شفاف ہو گیا۔

وہاب عندلیب (سابق صدر کرناٹک اردو اکیڈمی) کا خاکہ دلچسپ ہی نہیں بلکہ خاکہ نگار نے خود بھی اسے 'احتیاط' سے لکھا ہے۔ ایک جملہ دیکھیے: ''شہر علم و ادب گلبرگہ میں اردو تحریک کے میرِ کارواں، احتیاط پسند ادیب، محقق، مدبر، منتظم، ماہر تعلیم اور بہترین استاد ڈاکٹر وہاب عندلیب۔''

محمد اعظم اثر (و:8 اکتوبر 2020) اور مسعود عبدالخالق (و:19 ستمبر 2012) کے خاکے ان کے انتقال کے بعد لکھے گئے ہیں۔ تمام شخصیات میں ناظم خلیلی اگرچہ کرناٹک کے رائچور میں مقیم ہیں لیکن ان کا آبائی تعلق اتر پردیش کے ضلع بجنور سے ہے۔ ان کی پیدائش 30 دسمبر 1954 کو قصبہ نگینہ میں ہوئی تھی۔ ناظم خلیلی معلم کے ساتھ شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ انیس صدیقی لکھتے ہیں کہ وہ جتنے اچھے شاعر اور افسانہ نگار ہیں، اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ جملہ شخصیات پر لکھے گئے خاکے بھلے ہی فن کے اعتبار سے خاکہ نگاری کے اصول کی پاسداری نہ کرتے ہوں لیکن معلومات کے اعتبار سے انیس صدیقی نے ہر شخصیت کی چھان پھٹک (Scanning) بڑی مہارت سے کی ہے۔ البتہ ان شخصیات میں بھٹکل سے تعلق رکھنے والی شاعرہ محترمہ فرزانہ فرح کا خاکہ زیادہ ہی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں ہی مصنف کے 'جواز' (پیش لفظ) کے بعد فرزانہ فرح کی ایک دلچسپ 'خاکہ نما' تحریر (غالباً 'مقدمہ' صفحہ 9 تا 20) شامل ہے۔ اپنی تحریر میں فرزانہ فرح نے جگہ جگہ طنز و مزاح کے تیر برسائے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''نثر کے آسمان پر پرواز کرنے والے اس شاہین کو شاعری سے کم شغف ہے۔ بحر اور تقطیع کے میدان میں ان کی دال نہیں گلتی۔ اس لیے یہ اکیلا چنا تحقیق و تنقید کا بھاڑ جھونک رہے۔ نہ جانے کتنی اور کب لکھت پڑھت ہوتی ہے کہ ہر نو مہینے بعد ایک نئی کتاب یوں وارد ہوتی ہے جیسے مفلس کے گھر اولاد۔ آسانی کسی صورت حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ کتابیں بھی شائع کریں گے تو وزنی اور ضخیم۔'' (صفحہ 19)

اب ذرا ڈاکٹر فرزانہ فرح کا خاکہ انیس صدیقی کے قلم سے ملاحظہ کیجیے (صفحہ 105 تا 115)۔ خاکہ نگار نے فرزانہ فرح کا خاکہ کھینچتے ہوئے انتہائی پُرکشش اسلوب میں ان کی شخصیت کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''فرزانہ فرح تعجیل طبع ہی نہیں برق شتاب بھی ہیں۔ ان کی ہر حرکت و عمل میں ان کے مزاج کی عجلت پسندی نمایاں ہوتی ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، کسی بھی کام کو وقت سے پہلے نپٹانا، ہر معاملے میں وہ جلد باز ہیں۔ حتیٰ کہ بولنے، سوچنے اور فیصلہ لینے کے معاملے میں بھی ان کی برق رفتاری کا کوئی

مقابلہ نہیں۔ کلاس روم کا لکچر ہو یا نجی گفتگو، نئے مخاطب کو ان کے کہے کے مفہوم کو گرفت میں لینا مشکل ہے۔‘‘

نقاد کے نزدیک یہ خاکے اگرچہ فن کے لحاظ سے مکمل خاکے نہ بھی ہوں، تو بھی اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ انیس صدیقی نے اپنی تحریر میں ہر شخصیت کے خفی وجلی احوال کو بڑے دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کی زبان اردو کے بین الاقوامی اسلوب پر کھری اترتی ہے، دکنی اندازِ اسلوب سے تقریباً پاک ہے۔ اس خوبصورت پیش کش پر مصنف اور ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

□□□

سمندر پر ایک اُڑان (افسانے)

افسانہ: اختر واصف

تبصرہ: سعید اختر اعظمی☆

’’جانے کیسے یہ خبر عام ہوگئی ایک اِس طرف کا نوجوان شخص روز دیوار پھلانگ کر اُس طرف چلا جاتا ہے۔ اُس طرف سانولی سلونی سی ایک لڑکی ہے۔ دونوں روزانہ رات کے وقت جب اندھیرا سنّاٹے کے ساتھ لپٹ کر سویا ہوتا ہے، ملاقات کے چراغ روشن کرتے ہیں اور آبادی سے ذرا پرے ایک تالاب کی سیڑھی پر رکھ دیتے ہیں کہ ان چراغوں کی روشنی کا عکس رات بھر تالاب کے ہلکورے لیتے پانی میں پھیلتا رہتا ہے، سمٹتا رہتا ہے۔ اس خبر نے دونوں طرف آگ سی لگادی۔ ایک عجیب سی نفرت کی آگ جس نے دونوں ہی جانب نہ جانے کتنے لوگوں کو جھلسا کر رکھ دیا۔ تب ایسا ہوا کہ وقت کے سینکڑوں ہاتھ ایک بار پھر جمع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلی دیوار سے بھی اونچی ایک دوسری دیوار اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگ باگ مطمئن ہو گئے کہ اب کوئی اس طرف سے اِس طرف نہ آسکے گا۔ اب کوئی اِدھر سے اُدھر نہ جا سکے گا‘‘۔ یہ ایک دیوار کی کہانی ہے جو بلند و بالا ہونے کے باوجود ذرا سی ضرب سے زمیں بوس ہو جاتی۔ تبھی ضارب کے وجود میں ڈھیر ساری دیواریں سر اُبھارنے لگیں جنہیں مسمار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ’دیواریں ہنستی ہیں‘ کیونکہ یہ انا، ضد، خود پسندی اور تکبر کی ہیں جنہیں منہدم کرنا سہل نہیں۔ اختر واصف کا یہ ایقان صدفی صد درست ہے۔ انہوں نے علامتی دیوار کے ذریعہ قاری کو اس کی بنیاد رکھنے سے اعراض برتنے کی ترغیب دی ہے۔

’سمندر پر ایک اُڑان‘ اختر واصف کا اولین فکشن حوالہ ہے جو ایک درجن سے زائد افسانوں کو محیط ہے۔ ’ہاتھ‘ چشم دید سانحات میں اوروں کی طرح رُخ پھیرنے اور ضمیر کی آواز دبا دینے کے مقابلے میں انسانیت کی پکار پر لبیک کہنے کو مہمیز کرتا ہے جبکہ ’کچھ الّم غلّم چیزیں‘ رشتوں کی اقدار سنبھالنے اور تعلقات استوار کرنے کی تحریک ہے۔ ’فرد بیان‘ دنیاداری، عیاری، فریب کاری، رشوت اور کاروباری رنگ سے تزئین حیات کا خمیازہ ہے کہ یہ دنیا مکافات عمل ہے جو ایک نہ ایک دن ہو کر رہے گا۔ ’کمرہ‘ نسل نو اور قدیم زمانے کے افراد کا ٹکراؤ ہے جس میں یہ طے پایا جا چکا ہے کہ عہد حاضر کے نمائندے ہی سرخ رو ہوں گے۔ سرورق افسانہ ’سمندر پر ایک اُڑان‘ حصول زر اور تعیش کی خاطر ذلالت کی انتہا کو پہنچ جانے والوں کا شاخسانہ ہے جس میں ہوس ’ہل من مزید‘ کی متقاضی ہوتی ہے۔ ’آگ‘ مذہبی تعلیم کو غلط رنگ دے کر گمراہ کرنے والوں کی کارگزاری ہے جس سے نئی نسل کو جنت کا خواب دکھا کر انہیں جیتے جی جہنم میں دھکیلا جا رہا ہے۔ ’دوسرے درجے کا ٹکٹ‘ وقت بدلا مگر حالات نہ بدلے کا عکاس ہے جس میں دیہی معصومیت نکتہ عروج پر ہے۔ ’گلی‘ تبدیل شدہ دیہی منظر نامہ ہے جس میں شہری رنگ شامل ہو گئے ہیں۔ ’زمین میں گڑے ہوئے پاؤں‘ وجود سے فرار کی سعی ہے تو ’واپسی‘ قائدین کا عوامی لالی پوپ، جس سے وہ انہیں بہلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ’ایک یک بابی ڈرامہ‘ معصوم عوام کا احتجاجی قدم ہے تو ’محبت کی ایک کہانی‘ جذبہ وفا سے گوندھی گئی مالا ہے جس میں ہر خامی خوبی لگتی ہے۔ ’آخری راہ‘ احسان کا بدلہ چکانے کی ناتمام کوشش ہے جس کے نتیجہ میں

صفحات: 144 قیمت:-/250 اشاعت:2023
ISBN 978-81-19225-66-8
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2
رابطہ: افسانہ نگار، بیلی روڈ، پٹنہ-14 موبائل:7739166350

اولاد بغاوت کے راستے پر چل پڑتی ہے۔'وہ یہاں بھی آپہنچا' دیہی وشہری تہذیب کا فرق ہے۔ایک عفریت جس نے گاؤں میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیے تب اہل قریہ نے شہر پہنچنے میں عافیت جانی، یہاں بھی وہی وحشیانہ قہقہے تھے جن سے جان بچا کر وہ یہاں آئے تھے۔

یہ فکشن رنگ فکری تنوع کی دلکش تصویریں ہیں جس میں سماجی آئینہ داری خوبصورتی سے کی گئی ہے۔اختر واصف نے 'راہ نو' اختیار کرنے کی دُھن میں کہیں کہیں تجریدی روش اپنائی ہے جس سے عام قاری کو کردار کا سرا تلاش کرنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔انہوں نے آرا کی بیساکھی سے گریز کیا ہے جو یقیناً فال نیک ہے، لیکن 'مقصد تحریر' سے آگاہی فراہم کرانے کے لیے 'دیباچہ' کی اشد ضرورت تھی۔اس سے اعراض کا مطلب یہ ہے کہ فکشن نگار نے اپنا تحریری مطمح نظر بتائے بغیر قاری کو اپنی صوابدید کے مطابق رائے قائم کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔یہ خودمختاری قاری اور قلم کار دونوں کے حق میں سم قاتل بن سکتی ہے۔

☆ مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

اخلاق اثر بنام شکیل اعجاز

مصنف ومرتب: شکیل اعجاز

تبصرہ: محمد عارف اقبال

ڈاکٹر اخلاق اثر (مرحوم) کے شاگرد عزیز شکیل اعجاز کی یہ مختصر کتاب دراصل اپنے استاد محترم کے لیے خراج عقیدت ہے۔اس کے مطالعے سے استاد اور شاگرد کے مابین پاکیزہ اور بے ریا ربط وتعلق پر روشنی پڑتی ہے۔بھوپال کے ریجنل کالج آف ایجوکیشن میں شکیل اعجاز کی پہلی ملاقات غالباً 1976 میں اپنے استاد محترم سے ہوئی تھی۔شکیل اعجاز لکھتے ہیں کہ ''اردو کا پیریڈ استاذی اخلاق اثر صاحب کے چیمبر میں ہوتا۔وہی ان کا آفس بھی تھا۔چھ لڑکے اور دو لڑکیاں۔... استاذی اخلاق صاحب کی حوصلہ افزائی سے دوسرے شاگرد بھی پہلے سے زیادہ چمکنے لگے۔ڈاکٹر ایم آئی ساجد، مرزا رفیق شاکر اور ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی نے ادب میں نام کمایا۔''

شکیل اعجاز (پ:2 جولائی 1954) کو نوعمری سے مصوری میں بڑی دلچسپی تھی۔کالج کی سالانہ گیدرنگ کے پینٹنگ مقابلہ میں شکیل اعجاز کو اول انعام ملا تھا۔رفتہ رفتہ استاد محترم نے ان کو شاعری کے ساتھ نثری تحریروں کی طرف مائل کیا۔ڈاکٹر اخلاق اثر (پ:1937) ہی نے اپنے عزیز شاگرد کو اکولہ سے ممبر آف پارلیمنٹ شری ونے کمار پاراشر کے ساتھ اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کے لیے دلّی بھیجا تھا۔اس سے کالج میں شکیل اعجاز کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔اس کے بعد شکیل اعجاز کئی بار دلّی گئے تو ڈاکٹر اخلاق اثر نے بڑے ادیبوں کے نام خطوط دیے جن میں شارب ردولوی، ڈاکٹر مالک رام، کوثر چاند پوری وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے بی ایڈ ٹریننگ کی Internship ناگپور انجمن اسکول صدر سے کی تھی۔اس کے بعد وہ اسکول میں ٹیچر ہوگئے جہاں سے تیس برس کی تدریسی خدمات کے بعد سبکدوش ہوئے۔گزشتہ 45 برسوں میں شکیل اعجاز اپنے استاد محترم سے رابطے میں رہے۔اس درمیان میں ڈاکٹر اخلاق اثر کئی بار بھوپال سے اکولا آئے تو شکیل اعجاز سے ملاقات کی اور ان کے گھر بھی گئے۔زیر تبصرہ کتاب کا مسودہ بھی اپنے استاد کے پاس بھیجا تھا لیکن اس کی اشاعت کو انہوں نے فوری طور پر روک دیا تھا۔اس کے بعد 2021 میں ڈاکٹر اخلاق اثر انتقال کر گئے۔

زیر نظر کتاب 'اخلاق اثر بنام شکیل اعجاز' خطوط اور یادوں پر مشتمل ہے۔اس میں ڈاکٹر اخلاق اثر کے خطوط کے اقتباسات کے ساتھ شکیل اعجاز کی معلوماتی وتنقیدی تحریریں بھی شامل ہیں۔بحیثیت مصور، استاد اور مصنف، شکیل اعجاز اکولا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنی کتاب 'اردو کا پہلا ڈرامہ' کا سرورق شکیل اعجاز سے تیار کرایا تھا جبکہ وہ ریجنل کالج، بھوپال میں طالب علم تھے۔اس کتاب میں ڈاکٹر

صفحات: 76 قیمت:-/200 اشاعت: اکتوبر 2025
ناشر: شکیل اعجاز، مومن پورہ، اکولہ-444006 (مہاراشٹر)
Mobile: 7219319382

اخلاق اثر جن کا پورا نام سیّد اخلاق حسین تھا، کی جن اعلیٰ خصوصیات سے شکیل اعجاز نے روشناس کرایا ہے، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر اخلاق اثر ایک مثالی استاد تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا شماران اساتذہ میں ہوتا ہے جو اپنے شاگردوں کو اتنا چاہتے ہیں کہ وہ زندگی بھر کے لیے ان کے ہوجاتے ہیں۔

شکیل اعجاز صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے ڈاکٹر اخلاق اثر سے پہلی ملاقات یاد آگئی جب وہ تقریباً بیس برس قبل 'اردو بک ریویو' کے دفتر (واقع دریا گنج، نئی دہلی) میں تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے 2011 میں مرحوم رشید حسن خاں (و:26 فروری 2006) کے خطوط جلد اول (مرتب: ڈاکٹر ٹی آر رینا، جموں) کی فوری اشاعت کے سلسلے میں 'اردو بک ریویو' کے دفتر میں ڈاکٹر ٹی آر رینا کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ اس کی طباعت کے لیے ڈاکٹر ٹی آر رینا بہت پریشان تھے۔ 1038 خطوط پر مشتمل اس کتاب (جلد اول) کی دیدہ زیب طباعت وقتِ متعین پر ہوئی۔ اس سے ڈاکٹر اخلاق اثر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ جب بھی دلّی آئے خاکسار سے ملاقات ضرور کرتے تھے۔ 2020 میں جبکہ کورونا (Covid:19) میں پورا ملک مبتلا تھا، مرحوم نے 'اردو بک ریویو' کو تاحیات ممبرشپ کے لیے رقم ارسال کی تھی۔ افسوس کہ ڈاکٹر اخلاق اثر کے انتقال (10 نومبر 2021) کی خبر کسی بھی اردو اخبار میں نظر سے نہیں گزری۔ ان سے میری آخری گفتگو فون پر اگست اور ستمبر 2020 کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ خود ہی فون کیا کرتے تھے۔ وہ گزشتہ تین برسوں سے فالج کے سبب بستر علالت پر تھے۔ ہاتھ میں رعشہ کے سبب کوئی شاگرد وقتاً فوقتاً ان کے املا کو ضبط تحریر میں لاتے تھے۔

خاکسار کو ڈاکٹر اخلاق اثر (مرحوم) کے انتقال کی خبر ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کے مضمون (ہماری زبان، 28 تا 14 اگست 2021) سے ملی۔ یہ مرحوم کے شاگرد ہیں لیکن تاثراتی مضمون لکھنے میں ان سے بھی دیر ہوئی۔ بہر حال خاکسار نے 'اردو بک ریویو' کے مشترکہ شمارہ جولائی تا دسمبر 2022 کے 'وفیات کالم' کے لیے مختصر مضمون لکھا (صفحات 155 تا156)۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی نیکیوں کو شرف قبولیت بخشے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر سیّد اخلاق حسین 'اثر' ایک بے ریا انسان تھے۔ اہل علم کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ علمی اور ادبی کاموں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ شکیل اعجاز نے اپنی کتاب میں اپنے استاد محترم اخلاق اثر (مرحوم) کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، حقیقت پر مبنی محسوس ہوتا ہے کیونکہ خاکسار کے احساسات بھی ان کے بارے میں کچھ ایسے ہی ہیں۔

❑❑❑

درج ذیل کتب ہم سے حاصل کریں

تذکرہ شعرائے بریلی (1749-1949)
مصنف: ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب
قیمت: -/700

خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی
مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی
(نظر ثانی شدہ ایڈیشن)، قیمت: -/300

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی علمی و ادبی خدمات
مرتب: ڈاکٹر سیّد احمد خاں قیمت: -/320

اسلام اور جدید سائنس (اضافہ شدہ ایڈیشن)
مصنف: عبدالغنی شیخ قیمت: -/250

معرفت حیواناتِ قرآنی
مصنف: ڈاکٹر عبدالسمیع صوفی قیمت: -/400

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دھلی
Tel. 011-44753890 - 9953630788

سیّد لطیف الرحمٰن (مونوگراف)

مصنف: محمد اسلام

صفحات: 232، قیمت: -/152، اشاعت: 2024

ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی، 75/2A، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا-700016

از: ایم نصر اللہ نصر ☆

مونوگراف ایک طرح کی سوانح نگاری ہی ہے جس میں موصوف کی ذات، حیات، شخصیات اور ادبی وملی خدمات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ خدمات کے ابواب زیادہ ہوتے ہیں۔ شروع میں خاندان اور شجرہ کا بیان ہوتا ہے، پھر پیدائش کا پھر کوائف حیات کا تذکرہ ہوتا ہے، بعد ازاں موصوف کی تعلیم و تربیت ابتدائی وثانوی مع اسکول کالج و یونیورسٹی نیز مخصوص اساتذہ کرام کا، پھر ملازمت اور منصب کا۔ اس کے ساتھ ہی ملبوسات اور مخصوص عادات کا۔ لگے ہاتھوں ازدواجی زندگی کا ذکر بھی آنا لازمی ہے جس میں اہلیہ اور اولاد کا تذکرہ ہوتا ہے۔ پھر اگر کسی فن میں موصوف کو مہارت حاصل ہوتی ہے اور زیادہ کامیابی ملتی ہے اس کا بھی حوالہ پیش کرتے ہیں۔ آخری باب میں ملازمت سے سبکدوشی اور بعد کی زندگی نیز دنیا سے رخصت ہونے تک کی بات بھی کی جاتی ہے۔ اگر موصوف نے کوئی غیر معمولی ادبی، سماجی یا ملی کارگزاری کی ہے تو اس کو بھی بیان کرتے ہیں۔ یعنی مکمل حیات کے جائزہ کو مونوگراف کہتے ہیں۔

محمد اسلام نے مذکورہ نکات کی پاسداری کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ کام دیکھنے میں بڑا آسان لگتا ہے، درحقیقت ایسا نہیں۔ مواد کی عدم دستیابی کی صورت میں کافی پریشانی ہوتی ہے۔ محمد اسلام نے لطیف الرحمن کی سوانح حیات (جو انیس صفحات پر بسیط ہے) میں وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو مونوگراف کے لیے لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تذکرہ نگاری کا حوالہ دیتے ہوئے غالب شناسی، غالب سرائی، اقبال شناسی، فارسی دانی، حمد و نعت گوئی، غزل نگاری، مثنوی نگاری، رباعی گوئی، نظم نگاری، اور دیگر اصناف ادب کا بھی اچھا محاسبہ کیا ہے۔ اخیر میں محاکمہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''سید لطیف الرحمن مغربی بنگال کے ان فنکاروں میں تھے جو بڑی خاموشی کے ساتھ ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ انہیں نظم و نثر میں یکساں دسترس حاصل تھی۔ شاعری کے تقریباً ہر صنف کو انہوں نے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ شاعری میں وہ فطرت اور لطیف تخلص فرماتے تھے۔ خود کو کبھی شاعر نہیں مانا۔ کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ شاعری میں اقبال، غالب اور وحشت کے معتقد تھے۔ وہ کسی تحریک کے زیر اثر رہے نہ کسی ازم سے وابستہ۔ درس و تدریس ہی ان کا پیشہ رہا اور ادب ان کا اوڑھنا بچھونا۔ زندگی بھر مجرد رہے۔ ان کی زندگی کے دو مقاصد رہے تعلیم و تصانیف۔ دونوں میں وہ کامیاب رہے۔''

اس مختصر اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام صاحب نے کافی مطالعے اور معلومات کی تحصیل کے بعد ہی یہ مونوگراف لکھنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ 232 صفحات کو زیر تحریر لانا وہ بھی تحقیق کی روشنی میں، لائق صد ستائش ہے۔ اخیر میں انہوں نے موصوف کی تصانیف و تخلیقات کا ایک انتخاب بھی شامل کتاب کیا ہے جو ہماری موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے کسی بیش قیمت خزینہ سے کم نہیں۔ اس کے لیے مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، ہاوڑہ-711109 (مغربی بنگال) Mob: 9339976034

❑❑❑

مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: پروفیسر عبدالبرکات

ISBN 978-93-90579-29-7

صفحات: 152 (مجلد)، قیمت: -/300

رابطہ: اردو بک ریویو، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

Tel. 011-44753890 / 9953630788

تذکرہ شعرائے ناگور

مرتب: محمد سلیم سلاوٹ کامل ناگوری
صفحات: 324، قیمت: -/350، اشاعت: 2023
ISBN 978-81-962097-5-9
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔
مون ٹریڈرس، خان مارکیٹ، گاندھی چوک، ناگور-341001
(راجستھان) موبائل نمبر:9887652406

از: ایم نصر اللہ نصر☆

تذکرہ عربی زبان کے لفظ ذکر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ذکر کرنا، کسی کے حالات زندگی بیان کرنا اور چرچا کرنا ہے۔ اردو ادب میں اسے ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں کسی شخص کے مختصر حالات زندگی اور واقعات و سانحات حیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت، پیشہ و ملازمت کی بات کرتے ہیں۔ ازدواجی زندگی اور دیگر حالات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک طرح کی سرگزشت حیات ہے۔ سوانح نگاری کے اجزا بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بیشک اس کے لیے کافی تگ و دو کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے لیے مواد کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ایک پروفرما یا فریم کے ساتھ جب مرتب یا مصنف کام کرنا چاہتا ہے تو کبھی بھی اس کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ کبھی والدین کے نام نہیں ملتے تو کبھی تاریخِ پیدائش اور جائے پیدائش کا سراغ نہیں ملتا۔ ہر تذکرہ میں کچھ نہ کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ کچھ کے مواد اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں جو صنف تذکرہ نگاری کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ تذکرہ اکثر مختصر ہی ہوا کرتا ہے۔

ایسے حالات میں سلیم سلاوٹ کامل ناگوری نے ناگور کے شعرا کا تذکرہ اس کتاب میں پیش کیا ہے جن کی تعداد 75 کے قریب ہے۔ اس میں ہر ایک شاعر کا نام ولدیت، تخلص، تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، تاریخ وفات اور دیگر احوال واقعی کا ذکر سلیقے سے کیا گیا ہے۔ کسی کسی کی مفصل ہے تو کسی کی نہایت ہی مختصر۔ جس کا مواد جس قدر دستیاب ہو سکا ہے اسے زیر خامہ لایا ہے۔ اس میں ایسے شعرا کا ذکر ہے جو ناگور میں اپنی زندگی کے بیشتر اوقات گزارے ہیں۔ ایسوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اصل میں ناگوری ہیں مگر ملازمت اور پیشے کی غرض سے کہیں اور جا بسے ہیں اور ایسے شعرا کا بھی ذکر ہے جو دور دراز علاقوں سے نقل مکانی کر کے ناگور میں آ بسے ہیں۔ ان کی زندگی حالات، کوائف، اور کلام کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن موصوف نے کیا ہے۔ اس کے لیے وہ داد کے مستحق ہیں۔ ان کے حوصلے کی پذیرائی لازمی ہے۔

تذکرہ نویسی دراصل ایک طرح کی غیر افسانوی صنف ادب ہے۔ جس کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اس کے بھی اپنے اصول ہیں جس کی پاسداری لازمی ہے۔ یہ فنی اعتبار سے وہ کتاب ہوتی ہے جس میں کسی مخصوص علاقے یا پورے ملک کے مخصوص اور چنیدہ شعرا کی سوانحی نگارشات کو یکجا کر کتابی شکل دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی شرط اس کی ترتیب ہے کبھی معیار، کبھی سن پیدائش اور کبھی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہے۔ اس میں اس بات کا خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے کہ حقائق کی روشنی میں باتیں کی جائیں۔ کچھ لکھنے سے پہلے تحقیق کر لینا لازمی ہے۔ سنی سنائی باتوں کو بغیر تحقیق کے نہیں لکھنا بہتر ہے۔

محمد سلیم سلاوٹ کامل ناگوری نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ بیان میں حقانیت ہو، سچے واقعات کی تفصیل ہو اور دروغ گوئی سے پاک ہو۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، ہاوڑہ-711109 (مغربی بنگال) Mob:9339976034

❑❑❑

طرز بیاں اپنا (مضامین خاکہ نما اور خاکے)

مصنف: ڈاکٹر عظیم راہی
صفحات: 176، قیمت: -/250، اشاعت: 2023
زیر اہتمام: اسباق پبلی کیشنز، سائرہ منزل، 230B/102، ویمان درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونے-411032 (مہاراشٹر)
Mobile: 9370992203

از: ایم نصر اللہ نصر☆

'طرز بیاں اپنا' ڈاکٹر عظیم راہی کے ان شخصی مضامین کا مجموعہ ہے جن پر وہ گاہے گاہے قلم اٹھاتے رہے، ان کی ذات

اور شخصیات میں کمال کی بات ڈھونڈتے رہے، ان کے علوم و فنون کو کسوٹی پر کستے رہے اور کافی مطالعے اور مشاہدے کے بعد زیر خامہ لاکر ان کو عکس ریز کر دیا۔ یہ کام بہت آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے نیندیں حرام کرنی پڑتی ہیں، آرام وسکون کو تیاگنا پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ مواد کے لیے لوگوں سے رابطے پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ ان سے بھی ملنا پڑتا ہے جن سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود کبھی بات بنتی ہے اور کبھی نہیں بھی بنتی ہے۔ تفصیل میں تشنگی رہ ہی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت کی ہے اور اس کتاب میں سولہ علم داں، شاعر وادیب کی شخصیات اور ان کے فن پر اچھی گفتگو کرنے کی سعی کی ہے۔ جن کے نام کچھ یوں ہیں:

نذیر فتحپوری، قاضی مشتاق احمد، ایم۔ مبین، ڈاکٹر محبوب راہی، معین الدین عثمانی، میر ہاشم، قاسم رضا، نورالحسنین، وجاہت قریشی، رفیع الدین ناصر، دانش غنی، حامد اکمل، ایس رضا جالنوی، اسلم مرزا، ادھوماجن بسمل اور احمد اقبال۔

یہ ساری شخصیات کسی نہ کسی طرح شعر وادب اور فکر وفن سے جڑی ہوئی ہیں اور شعر وادب کے ساتھ علم وہنر کی خدمات انجام دے رہیں یا پھر دے چکی ہیں۔ ہر ایک کے تعلق سے راہی صاحب نے کھل کر بحث کی ہے۔ ان کے کام اور ادبی خدمات کو طشت از بام کیا ہے۔ یہ تصنیف تشنگانِ علم وفن اور جویان شعر وادب کے لیے بیشک معلومات کا خزانہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ چند کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

''نذیر فتحپوری دوسرے شاعروں کی طرح صرف زبانی جمع خرچ نہیں کرتے بلکہ تعمیری ادبی سرگرمیوں اور سماجی اصلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جس میں سوائے بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا مگر یہ قلندر آدمی تو صرف کام کرنا چاہتا ہے۔ نام سے واسطہ بھی نہیں رکھتا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ کسی بھی علاقے سے اردو رسالے کی اشاعت کی جاسکتی ہے 'اسباق' کی شکل میں وہ 18 سال تک نہایت صبر وضبط اور تحمل کے ساتھ ادارت کو سنبھالے رہے۔''

''قاضی مشتاق آج کے سب سے مقبول اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ بیشتر معیاری ادبی رسالوں، جریدوں میں ان کے افسانے چھپتے رہتے ہیں۔ قارئین ان کی تازہ ترین تخلیقات کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کا پورا خیال رکھتے ہیں۔''

''ایم مبین علامتی افسانے بھی اچھے لکھتے ہیں اور تمثیلی رنگ میں ڈوبے افسانے بھی۔ ایم مبین پہلے پہل صرف اردو میں ہی لکھا کرتے تھے اور اردو کے کمرشیل اور ادبی رسائل میں چھپتے تھے لیکن اردو والوں کا معاملہ تو سب سے نرالا ہے۔ معاوضہ ادا کرنا تو کجا اکثر رسالے کی اعزازی کاپی تک نہیں ملتی اوپر سے اردو کو گلے لگانے کے نتیجے میں اسٹیشنری اور ڈاک خرچ الگ۔''

اس طرح دیکھا جائے تو ڈاکٹر عظیم راہی نے ایک اہم کام کیا ہے۔ مختلف احساسات وجذبات کے ساتھ ان حقائق سے پردہ بھی اٹھایا ہے کہ ایک تخلیق کے لیے ادیب کو کن کن مشکلات ومراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور صلے میں مالی طور پر کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا کام اچھا ہوا ہے۔ ان کی ستائش لازمی ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمارا پارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، باوڑہ-711109 (مغربی بنگال) Mob:9339976034

□□□

ماہنامہ 'اردو آنگن' ممبئی

(حافظ عمادالدین خاں مرادسعیدی خصوصی شمارہ)

مدیر: مشیر احمد انصاری
صفحات: 116، قیمت: -/100، اشاعت: اکتوبر 2025،
جلد: 10، شمارہ: 8-7۔ پتہ: اردو گگن سنستھا، ممبئی، معرفت انصاری مشیر احمد، Bakhar Chawal, R-14, 9-A، Ist Ghellabhai Street, Byculla (W) Mumbai - 400008, Mob: 9324406948

—— از: محمد عاصم☆

تعمیری ادب کا نمائندہ جریدہ 'اردو آنگن' ممبئی نے حافظ عمادالدین مرادسعیدی کے فن وشخصیت پر خصوصی نمبر شائع فرما کر بلاشبہ اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ مرادسعیدی نہ صرف شاعری

کے اعتبار سے بڑے تھے بلکہ وہ اخلاق اور کردار کے لحاظ سے بھی عظیم انسان تھے۔ ان کا کلام ذہنی عیاشی، لہو ولعب، آوارہ خیالی یا شراب وشباب اور تضیع اوقات جیسی کثافتوں سے پاک ہے۔

اردو آنگن ممبئی (اکتوبر 2025) کے اس خصوصی شمارے میں حمد و نعت کے بعد چار نظمیں و 23 مضامین مراد سعیدی کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اداریہ، ادارتی نوٹ، سند فارغ الاصلاح مع دستخط بسمل سعیدی، مراد اکیڈمی کا تعارف پیش کرتیں تصاویر، نواب آفتاب علی خان ٹونک، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، ہریش چندر مینا اور سچن پائلٹ کے خطوط (مع دستخط) سے یہ خصوصی شمارہ مزین ہے۔ اداریہ کا آغاز غلام محمود بنات والا مرحوم (سابق ممبر آف پارلیمنٹ، انڈین یونین مسلم لیگ) کی ایک تقریر کے اقتباس سے کیا گیا ہے، جو ہمارے گھروں کے کل کے اور آج کے فرق کو واضح کرتا ہے۔

'نقوش ماضی' میں مراد سعیدی کے فرزند اصغر فہیم الدین خان نے مراد سعیدی کی ہمہ جہت شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ نذیر فتح پوری (پونہ) نے 'منزل عشق کا راہی: مراد سعیدی ٹونکی' کے عنوان سے اپنے مضمون میں سیّد ساجد علی ٹونکی کی مرتب کردہ کتاب 'مراد سعیدی: شخص اور شاعری' کے حوالے سے اپنی بات کہی ہے۔ فاروق جائسی نے اپنے پُرمغز مضمون میں مراد سعیدی کی چار بیتوں کے عروضی تجزیہ کے ذریعے بحور و اوزان ظاہر کیے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری نے اپنے مضمون میں مراد سعیدی کے کلام کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس شمارے میں طنز ومزاح کے معروف ومقبول شاعر ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی کا مختصر مضمون بعنوان 'ٹونک کا درخشندہ ادبی ستارہ' بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر ماجد دیوبندی اپنے مضمون 'شاعری میں منفرد لہجہ کی بازگشت: مراد سعیدی ٹونکی' میں لکھتے ہیں کہ ''مراد سعیدی کے یہاں اقبال کا رنگ جگہ جگہ موجود ہے۔''

اردو آنگن کے اس مراد سعیدی نمبر میں ملک کے مختلف صوبوں کی طرح صوبہ مہاراشٹر کے قلم کاروں کی بھی تخلیقات شامل ہیں۔ پربھنی کے ڈاکٹر نور الامین (ابعادِ غزل کا شاعر: مراد سعیدی)، پونہ کے اسلم چشتی (مراد سعیدی: شخص اور شاعر، مضامین)، جلگاؤں کے ساجد علی قادری (شہر ٹونک کا ادبی وارث: مراد سعیدی)، اکولہ کے ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی (ٹونک کا چراغ فروزاں) اور جلگاؤں کے وحید امام (افکار، خیالات، احساسات وجذبات کا کامیاب ترجمان شاعر: مراد سعیدی) وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر خان محمد رضوان نے 'مراد سعیدی کا شعری آفاق: ایک تقابلی مطالعہ' میں مراد سعیدی کی شاعری کا حفیظ میرٹھی، مخمور سعیدی، شہریار، بشیر بدر، فرحت احساس اور شہپر رسول کی شاعری سے تقابل کیا ہے۔ محترمہ سرتاج جہاں (میرٹھ) نے مراد سعیدی کی شاعری کو 'انصاف کے تناظر میں' دیکھا ہے۔ محترمہ فردوس انجم (بلڈانہ، مہاراشٹر) نے مراد سعیدی کی نظم نگاری کو جدید اردو نظم کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر شمشاد علی (باراں، راجستھان) نے اپنے مختصر مضمون 'ٹونک کی ادبی فضا میں گونجتی ایک معتبر شخصیت' میں تحریر کیا ہے کہ ''اردو شعر وادب کے فروغ میں مراد سعیدی کے گراں قدر کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔'' ڈاکٹر سعادت رئیس (ٹونک) نے مراد سعیدی کی عشقیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عشقیہ مضامین کی رو سے اگر مراد صاحب کے تینوں مجموعہ ہائے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو ان کے کلام کا رنگ مومن، غالب اور داغ جیسے اعلیٰ مرتبت شعرا سے قریب تر لگتا ہے۔'' چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پاس آتا نہیں ہے غم کوئی
جب میں اُن کے حضور رہتا ہوں

سمجھتے تھے بہت آسان جس راہ محبت کو
اسی راہ محبت میں ہزاروں پیچ و خم نکلے

سہیل پیامی نے معروف قلم کاروں کے مضامین کے اقتباسات 'مراد سعیدی اور مشاہیر نقد ونظر' عنوان سے پیش کیا ہے۔ جبل پور کے محمد مستقیم رضا کا مضمون 'آسمان شاعری کا ایک روشن ستارہ مراد سعیدی' اور دہلی کے ڈاکٹر خالد مبشر کی مختصر تحریر بھی قابل مطالعہ ہے۔

☆مبصر کا پتہ: عثمانیہ پارک، مدینہ کالونی، جلگاؤں۔ مہاراشٹر
Mobile: 9252997415 ❑❑❑

چاند نکلا ہے (مجموعہ نظم وغزل)

شاعر: سیف سمستی پوری

ترتیب وتدوین، مقدمہ: ڈاکٹر محمد محسن خان

صفحات: 612، قیمت: -/600، اشاعت: 2024

ملنے کا پتہ: حسن پورہ پوسٹ آفس، لال بازار، کلٹی، ضلع ویسٹ بردوان-713343 (مغربی بنگال) Mob: 8250750227

——— از: سعید اختر اعظمی☆

سیف سمستی پوری (محمد علی امام خاں، ولادت: 20 فروری 1937، وفات: 21 مئی 2009) کو ابتدا سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔ اگرچہ خانگی مسائل اور معاشی تنگی کے سبب وہ خاطر خواہ تعلیمی مراحل طے نہ کر سکے، تاہم ذاتی مطالعہ نے ان کی شخصیت کو معتبر بنا دیا۔ وہ کم عمری میں اپنے تینوں بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے بردوان مغربی بنگال کے اسپات کارخانہ میں ملازم ہوگئے ۔یہ دورانیہ (1951 تا 1991) چالیس برسوں پہ محیط رہا۔ وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے دوران شعر گوئی کی جانب مائل ہوئے۔ دوران ملازمت رسالہ ’بگولہ‘ کے مدیر علامہ شغف سینائی اور جرم محمد آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ انہیں قیصر شمیم کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی سے استفادہ کا بھی موقع ملا۔ وہ رسالہ ’دیوار‘ برنپور کے مدیر تھے جو چند برسوں تک پابندی سے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ مقامی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت، ریڈیو نشریات میں کلام کی شمولیت اور ادبی رسائل میں تخلیقات کی اشاعت سے ان کی ادبی حیثیت میں اضافہ ہوا۔ ادارہ شاخ ادب سمستی پور بہار کی جانب سے 64 صفحات پہ مشتمل ’قندیل‘ کی اشاعت عمل میں آئی ۔شعرائے سمستی پور کے اس مختصر انتخاب میں ان کی منظومات وغزلیات کے شانہ بہ شانہ مختصر حالات زندگی بھی شامل کیے گئے۔ ان کے شاگردوں میں شاہد برنپوری ، رئیس الہ آبادی اور عظیم الدین عظیم نے استاد فن کا نام روشن کیا۔ وہ عمر کے آخری پڑاؤ پر کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس میں بائیں پاؤں میں ناقابل برداشت درد ہوتا تھا۔ انتقال سے بارہ ماہ قبل لکھی گئی نظم میں انہوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن خان کا شمار سیف سمستی پوری کے غم گساروں اور دیرینہ شناساؤں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے صاحب سخن سے کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ ہر ملاقات میں ایک ہی خواہش کا اظہار ہوتا کہ میری زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ بچوں کی اپنی دنیا ہے اور دوست اس قابل نہیں کہ مسودہ ان کے حوالے کیا جا سکے ۔انہوں نے وقت آخر میں یہ بار امانت ان کے سپرد کر ہی دیا تاکہ یہ منطقی انجام تک پہنچ سکے۔ 2009 میں سیف سمستی پوری کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری دوچند ہوگئی کیونکہ یہ خواہش ناتمام بہر طور پوری کرنی تھی۔ سیف کے دونوں بیٹوں اظہر امام خاں اور سہیل خاں نے اخبارات ورسائل میں شائع شدہ تخلیقات مع قلمی مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ بیٹیوں کا تعاون بھی قابل قدر رہا۔ یوں ان کے کئی قلمی نسخے ہاتھ آ گئے اور ترتیب و تدوین کا مرحلہ سر کرنا آسان ہو گیا۔ ایک دہائی سے زیادہ کا وقت اسے یکجا کرنے میں لگا۔ مرتب نے دیگر سرگرمیوں کے ساتھ اسے سرفہرست رکھا اور یوں یہ اشاعت کے مرحلے تک پہنچ ہی گیا۔ فاضل مرتب کا ماننا ہے کہ ان کا منجملہ شعری سرمایہ نظم و غزل کی صورت میں قارئین کے روبرو ہے جو دراصل سیفؔ کی ’ندائے ذات‘ ہے۔ جانے کیوں اسے ’مجموعہ نظم وغزل‘ کا نام دیا گیا ہے جبکہ اسے ’کلیات‘ کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ ’چاند نکلا ہے‘ عنوان مجموعہ ان کے ایک مشہور شعر سے ماخوذ ہے جو امتیازی شناخت بھی ظاہر کرتا ہے۔

ابتدائی صفحات میں پروفیسر علیم اللہ حالی اور فاضل مرتب کی ایک تحریر اور طویل مقدمہ شامل ہے جس میں سیف کے فکر و فن پہ سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بعد ازاں حمد و نعت ،مراثی، رمضانیات، 264 غزلیات، 35 منظومات، قطعات ومتفرق اشعار کی شمولیت ہے۔ سیف کے تخلیقی عمل میں شعری لطافت، دل کشی ورعنائی کے شانہ بہ شانہ تاثیر کلام، حسن بیان اور لطف زبان بھی ہے۔ انہوں نے واردات زندگی کے بیانیہ کے ساتھ

اس کے نشیب وفراز پہ بھی نظر رکھی ہے۔ان کے حسن وعشق میں سوز وگداز ہے تو عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل کی عکاسی بھی نمایاں ہے۔ان کے تنوع رنگ اشعار کی کہکشاں ملاحظہ کیجیے:

وہی ہوتے ہیں مسافت کی تھکن سے واقف
اپنے کاندھے پہ جو ہیں بوجھ اُٹھانے والے

....

گھر میں رہتا ہوں تو دل اور کہیں ہوتا ہے
گھر کے ہوتے ہوئے ہم آج بھی بے گھر نکلے

....

فاقوں میں دن گزر گیا، رات آئی سو گئے
مفلس کی زندگی ہے یہ،غربت کی شام ہے

....

شاید کسی کا خط ہو یا چہرہ چھپا ہوا
وہ دیکھتے ہیں میری کتابوں کو کھول کے

....

خود سب کچھ منوا لیتا ہے
وقت بڑا ضدی بچہ ہے

ہندی اور انگریزی الفاظ کا استعمال بھلے ہی عجیب لگے لیکن ان کی شاعری میں نیا لطف دیتا ہے۔بطور نمونہ یہ اشعار دیکھیے:

سیف صاحب کتاب مت کھولیں
غم کی روداد اس میں ٹوٹل ہے

....

کاہے کو اس کی بات پر تم دیتے ہو دھیان
اس کی سمجھ ہی اتنی ہے ، ہے جس قدر گیان

....

خاک ان کے بھی لب کو چاٹ گئی
جن کی باتوں میں تھی مٹھاس بہت

....

ہجوم یاس میں رہ کر کوئی کب کو پنپتا ہے
منافع اس سے کیا پائے یہ اک گھاٹے کا سودا ہے

شعر وشاعری کی اہمیت وافادیت کو انہوں نے تعلّی کے رنگ سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ اشعار اس حوالے کی معتبر دلیل ہیں:

ہمارے بعد بھی چرچا رہے گا لوگوں میں
ہمارے شعر کی ہر بات سب کو جچتی ہے
ضرور اس کو محقق تلاش کرلیں گے
ہمارے شعر میں کیا خوبی، کیا خرابی ہے

....

شعر نازک لبوں کا موتی ہے
یوں سجاؤ کہ جگمگانے لگے
سیفؔ ہم ایک شعر کی خاطر
خون دل کا دیا جلانے لگے

....

یہ قلم کی روانی کی تاثیر ہے
دل کی آواز خاموش تحریر ہے

....

دیوان میرؔ یہ نہیں، ہے سیفؔ کی غزل
ہر شعر ناقدوں کے لیے امتحان ہے

....

سیفؔ کے شعر میں ہے ماہ لقا کی خوشبو
ذکر کیا گاؤں کا، ہر شہر کا منظر مہکے

منظومات میں شخصی مراثی کے رنگ کے علاوہ ذاتی درد کا بیانیہ بھی ہے۔'نظم ہستی' کے یہ اشعار دیکھیے:

کون آئے ہماری پُرسش کو
کون دیکھے ہمارا جسم نزار
حال اپنا خزاں رسیدہ ہے
کب مری زندگی میں آئے بہار
میرے دکھ پر یقین کون کرے
دکھ کی آواز بھی ہے زمزمہ بار
سارے غم کو دبا کے رکھتا ہوں
میرے جیسا کہاں امانت دار
اے خدا بخش دے گنہ میرے
لب پہ جاری ہے توبہ استغفار

وہ شعر بھی ملاحظہ فرمالیجیے جو اُن کی پہچان ہے جس طرح

بشیر بدر کی پہچان 'اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو' ہے۔

دن کے ہنگاموں میں ہم بھول گئے تھے تجھ کو
چاند نکلا ہے تو پھر تیرا خیال آیا ہے

اسی خیال کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے جسے تحریر ہٰذا کا اختتامیہ بنایا گیا ہے:

مزید اپنا تعارف بیان کیا کرتے
ہمارا شعر ہی پہچان کا وسیلہ ہے

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔ (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

آئندہ (شعری مجموعہ)

شاعر: سلیم محی الدین

صفحات: 264، قیمت:-/349، اشاعت: 2025
ISBN 978-81-983026-5-6
ناشر: ریختہ پبلی کیشنز، B-37، بلاک B، سیکٹر 1،
نوئیڈا-201301(NCR) موبائل نمبر: 9560566775

——از: ایم نصر اللہ نصر☆

شعری مجموعہ 'آئندہ' محبوب و مقبول شاعر و ادیب سلیم محی الدین کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کی شہرت اور شناخت محتاج تعارف نہیں۔ اپنے حلقے میں ان کی بڑی قدر ہے۔ ادبی دنیا میں بھی ان کی اپنی ایک خاص پہچان ہے۔ سلیم محی الدین کی پیدائش 23 فروری 1963 کو مردم خیز علاقہ پربھنی میں ہوئی۔ پہلے مجموعۂ سخن 'وابستہ' کی اشاعت کے پچیس سال بعد یہ دوسرا مجموعہ 'آئندہ' منصۂ شہود پر آیا ہے جس کی اہمیت و افادیت نیز پختگی اور بالیدگی کا قائل ہونا لازمی ہے۔ بیشک اس طویل مدت کی مشاقیت کے بعد 'لیکن' کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس مدت میں شاعر شعر و سخن کی ایک ایک باریکی اور فنی تقاضے سے واقف ہو جاتا ہے سو سلیم محی الدین بھی اب سخن فہم اور سخن طراز بن چکے ہیں۔ اچھے اشعار کہتے ہیں، اچھی سوچ رکھتے ہیں۔ اسلوب میں نکھار ہے زبان میں شگفتگی، اشعار میں تازگی اور بیان میں سادگی کے ساتھ جدت و ندرت بھی ہے۔ موصوف کے متعلق کہا گیا ہے:

''ان کے شعری مزاج میں ایک طرح کی تمکنت، نزاکت اور جمالیات کی فراوانی ہے۔ انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور اقدار کے زوال کا احساس بھی موجود ہے۔ وہ نثر و نظم دونوں اصناف میں مہارت رکھتے ہیں۔ اشعار میں فصاحت اور بلاغت کے نقوش بھی نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کے بیشتر رنگ بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ زبان میں چاشنی اور شیرینی کی آمیزش ہے۔ افکار کی بلندی خیال کی پاکیزگی سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔'' مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

دل ہے درد کی کھیتی، آنکھ خواب کی بستی
جاگتے رہے پھر بھی نیند کا مزا پایا

شیشۂ دل یہ لیے گھر سے کہاں نکلے ہو
تم کو معلوم نہیں شہر ہے یہ پتھر کا

کشتیوں کے سفر سے ڈرتے ہیں
ہم جزیروں میں جیتے مرتے ہیں

بے کماں ہیں پہ تیر رکھتے ہیں
ہم کہ زندہ ضمیر رکھتے ہیں

مذکورہ اشعار اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ موصوف کی شاعری کسی پکے ہوئے دماغ کی پیداوار ہیں۔ کسی مشاہدہ گزار کی خوبصورت تخلیقات ہیں، اس شاعر کی شاعری کی مثال ہیں جس نے صحرائے سخن کی صحرا نوردی میں عمر کا طویل حصہ گزارا ہے۔ کوثر مظہری کے خیال میں:

غزل ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں محبوب سے گفتگو، اس کے حسن و عشق کا ذکر، تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، سماجیات اور سیاسیات پر مشتمل موضوعات و مضامین کو زیر بحث لاتے ہیں۔ غزل کے اسلوب میں منتشر حقائق کو جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر عہد حاضر کے شعرا نے اس کی زلفوں کو سنوارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ منتشر خیالات و حقائق کو جامعیت عطا کی ہے۔ سلیم محی الدین نے بھی یہی کام کیا ہے اور اس کے قبائے زریں میں ستارے ٹانکنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ زندگی کے مختلف مسائل و حقائق کو جدت

اور ندرت کے ساتھ پیش کرنے کی اچھی سعی کی ہے۔ چند اشعار اور دیکھیں:

زمیں کم ہے یہاں پانی بہت ہے
تری دنیا میں حیرانی بہت ہے
نہیں لازم ہمیں صحرا نوردی
ہمیں تو گھر کی ویرانی بہت ہے
دل پہ طاری ہے موسم ہجرت
کیا کریں اب سفر نہیں ہوتا
شاخ سے پھول ٹوٹ جاتا ہے
یوں کوئی در بدر نہیں ہوتا
کیا نئی بات کہہ رہا ہوں میں
رات کو رات کہہ رہا ہوں میں
ایک موسم ہے میری آنکھوں میں
جس کو برسات کہہ رہا ہوں میں

شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو احساس کی رگوں میں وہ تحرک پیدا ہوگا جو دل کے شکستہ تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گا۔ موصوف نے اپنی شاعری میں ان مضامین کو تشکیل سخن دیا ہے جس کی طرف شعرا کی نظر جاتے جاتے رہ جاتی ہے۔ ایک طرح سے کہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے چھوئے ہوئے مضامین کو نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ نیا رنگ دیا ہے یعنی نئے لہجے سے شاعری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تھوڑی اور محنت اور توجہ دی جاتی تو اس میں اور نکھار آسکتا تھا۔ مختصر یہ کہ ان سے اور بہتر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

☆مبصر سے رابطہ: ہاوڑہ (مغربی بنگال) Mob: 9339976034

□□□

اُردو سیکھنے کا نیا طریقہ
Modern Method to Learn Urdu
ISBN 978-93-83239-98-6
صفحات: 224، قیمت: -/220، اشاعت: 2022
رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ Mob: 9953630788

پنسل کے نشان (شعری مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر معظم عزم
صفحات: 216، قیمت: -/300، اشاعت: 2024
ISBN 978-93-90579-65-5
ناشر: ایپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی-110002
Mobile: 9953630788

——از: سعید اختر اعظمی☆

کاغذ پہ کھینچی گئی لکیریں مہارت فکر سے باخبر کراتی ہیں تو یہ صناعی کی فضابندی بھی کرتی ہیں۔ یہ تحریر کی ابتدائی منزل بھی ہوسکتی ہیں اور قوت تخلیق کا تحفظ بھی۔ قرطاس پہ منتقل ہونے والی ہر تحریر اپنی جگہ محفوظ کرلیتی ہے اور زندگی کی رنگا رنگی کا اعلامیہ بن جاتی ہے۔ پنسل کی کارفرمائی پر ربر کے توسط سے تبدیلی ممکن ہے جبکہ خامہ کی کارکردگی پختہ اور مستحکم ہوتی ہے۔ لکیروں اور تحریروں کی صورت میں بننے والے پنسل کے نشانات عارضی ہوتے ہیں جنہیں سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر معظم عزم نے جو'پنسل کے نشان' لگائے ہیں وہ باطن کے آئینہ دار ہیں۔ یہ تخلیقیت کے نشان ہیں جن کے نقوش انمٹ اور تادیر قائم رہنے والے ہیں۔

'آذین' (2012) کے بارہ برس بعد'پنسل کے نشان' کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ یہ اڑسٹھ غزلوں اور ساٹھ نظموں پہ مشتمل ہے جنہیں مخلوط رکھا گیا ہے۔ مجموعے کا نام ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم بتلاتی ہے کہ پنسل کے نشانات جب لفظوں تلے آتے ہیں یا لفظ کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں تو کبھی یہ فسانہ صبح بن جاتے ہیں تو کبھی داستان شب، کبھی کہکشاں یا تاروں کے جھرمٹ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں تو کبھی خوابوں کے کارواں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ حروف میں پنہاں آسمان ہوتے ہیں۔ شاعر پنسل کے حوالہ کو معتبر کرنے کے لیے ماضی کا سہارا لیتا ہے۔ جب ریت پہ انگلیوں کی گردش نے صدف سی مصوری کی تھی جسے لہروں کے ڈسٹر نے مٹادیا، وہ تصاویر نہاں خانہ دل میں اب بھی جواں ہیں۔ وہ بھی کیا زمانے تھے جب چاند کا زاویہ بنا کر رات

کا حاشیہ باقی رکھتے تھے۔ رنگ بھرنے کے لیے دھنک کی سیاہی کا استعمال کرتے تھے۔ یہ ماضی کے ایسے خواب ہیں جو ذہن ودل میں تمام تر رعنائی کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ ایسے پنسل کے نشان ہیں جنہیں کوئی بھی ڈسٹر نہیں مٹا سکتا۔ 'تو اللہ خوش ہوجاتا ہے' تمہیدی نظم ہے جو رضائے الٰہی کے مختلف نکات پیش کرتی ہے۔ برہمی کے جذبات پہ قدغن، فتح کے باوجود دشمن کے سامنے خمیدگی، دشوار گزار حالات میں ایمان کی سلامتی، محفل مسرت میں اشکوں کو چھپانے کا عمل، عوام کے لیے اپنے عیش کو تج دینے کا ایثار، طیش پہ قابو، دنیا کی رونقوں سے آنکھیں چرا کے دل مٹھی میں لے کر گھر واپسی، اپنے درد کو فراموش کر کے اوروں کے غم کا احساس اور اُن کی راہوں کے خار چننے کی جستجو یقینی طور پہ صالح انسان کی اعلیٰ صفات ہیں جو عبد ومعبود کو خوش کرتی ہیں۔ 'ننھی پری' میں ماں جائی کے ابدی ہجر کو 'گمشدگی' سے تعبیر دیا گیا ہے۔ تین بند پہ مشتمل اس نظم کا آخری بند دیکھیے:

مجھ کو معلوم ہے چاند ہے دل نشیں/ پر وہاں ایسی کوئی بھی بستی نہیں/ جس میں اسکول ہو، باغ ہو، پارک ہو/ زندگی کا جہاں کوئی اسپارک ہو/ کہ جہاں پہ مکاں، پیڑ پودے ملیں/ کہ جہاں پہ کھلونے، گھروندے ملیں/ صرف اک بوڑھی عورت کئی صدیوں سے/ بیٹھ کر بُن رہی سوت چرخہ لیے/ کیا وہی بوڑھی عورت ہی تجھ کو ملی/ اس نے تجھ کو کہانی سنائی کوئی / یا کہیں یہ بھی کوئی پہیلی نہ ہو/ اے بہن تو وہاں پر اکیلی نہ ہو/ بس یہی سوچ کر میں پریشان ہوں (ص 41)

'زندگی کا نقش' پیرہن کی سلوٹوں اور چنچل کروٹوں کا بیانیہ ہے تو 'رہ گزر بن گئی' شاخ حیات پہ دھند سے لپٹی سحر کے نظر بننے کی داستان۔ 'آفریں' بوسہ جبینی، سجدہ نشینی، الفت گزینی، دل نشیں جلوہ نمائی، شان خدائی، آن گدائی، مہ جبیں روئے محبوبی، زہد مشروبی، راہ مجذوبی، نازنیں وجہ تبسم، بزم ترنم، جان تکلم، بہتریں نظر عنایت، چشم رعایت، رسم شکایت، برزیں جام خلوت، شام جلوت، باغ جنت، حسیں حور مجسم، خواب معظم اور عزم مصمم سے عبارت ہے تو 'قدموں کی پرواز' زندگی کی پکار ہے جو وقت کے ساز پہ نغمہ چھیڑنے کو کہہ رہی ہے۔ 'منزلوں پہ' مسکراتی نگاہیں، چاہت بھرے چہرے، گلیاں اور میلے ہیں تو 'غم نشہ سا' نینوں کی شب بیداری کا سحر۔ 'دیکھ لیا تو نے' سکون نجوم، جنون کوہ وجبل اور خون بہاراں انسانوں کو نذر کرنے کا معاملہ ہے تو 'خوابوں کی سرزمیں' گزرے ہوئے لمحوں کی مسکراہٹ کی یادوں میں موجودگی۔ 'دھندلی سی روشنی' رشتے، رستے اور لمحے کو بصارت کے توسط سے چننے کا عمل ہے تو 'شبنم شبنم دھوپ' میں حیرانی شب اور روشن ستاروں کو سامان مژگاں بنایا گیا ہے۔ 'رات کے سرہانے'، 'اور کیا چاہیے'، 'پہلی سی راتیں'، 'زندگی جھوم اُٹھی'، 'باورے'، 'خوشبو کی سوغات'، 'لوری''، 'اور پھر قلم بن جائیں'، 'ریت کی چاندنی'، 'مشکلوں سے پرے'، 'ہاتھوں میں جب ہاتھ ملے ہیں'، 'سوچا بھی ہے'، 'وہ شام آ گئی'، 'یاد حسیں کی حسیں ہے'، 'مختلف ہرادا'، 'چاند موم سا'، 'رات کے زینے سے'، 'گیلی مٹّی کے مکاں'، 'ریشمی زندگی'، 'عشق ہی سے ہے حسیں'، 'دل کا سودا'، 'محور قصاں'، 'ایسا کیونکر لگتا ہے'، 'نہ داستاں نہ کہانی'، 'یہ بتا'، 'مست قلندر'، 'مرے محبوب کے صدقے'، 'دیکھ باقی ہیں ابھی'، 'بادلوں کی طرح'، 'ہم ابھی سفر میں ہیں'، 'کوئی نہیں'، 'عرضی'، 'خودی'، 'خواب دکھاتے کیوں ہو'، 'نئے خواب ملے'، 'دل لبھاتا نہیں'، 'کائنات میں'، 'پنکھ لگے ہیں'، 'چاہت بھرے لمحوں کی'، 'چلن'، 'پل میں' اور 'لمس' میں بیشتر نظموں کا تانا بانا رومان سے بُنا گیا ہے جن میں سے اکثر 'سپنے' کے ارد گرد ہے۔ 'جدید تر' اور 'تیرے نشاں' دراصل محامد ہیں جنہیں آغاز مجموعہ میں رہنا چاہیے تھا۔ اسی حوالے کو مستحکم کرتی نظم 'ماتھے کی اذاں' ہے جو دراصل مناجات ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمائیے:

ماتھے کی اذاں سے/ سجدے کی زباں سے/ ہاتھوں کے رحل سے/ اس دل کے قرآں سے/ زینہ بہ زینہ جو/ چڑھنے لگی ہے/ میں نے وہ کی ہے دعا/ سن لے تو میری صدا۔ (ص78)

دو نظموں میں 'حمد' کا رنگ غالب ہے جبکہ 'نعت' کا رنگ کسی نظم میں نہیں ہے۔ پہلی غزل میں ایک شعر آمد نبی آخرالزماں' کے حوالے سے ہے جسے نعتیہ کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نور احمد زمیں پہ لانے کو
آمنہ کا ظہور ہوتا ہے

غزلوں میں موضوعات کی تنوع رنگ کہکشاں حسن قرآت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ:

سرخ سورج کی پہلی کرن جھوم کر
دھند سے ایسی لپٹی سحر بن گئی

جان آنکھوں میں آ کے اٹکی ہے
بس تمہارا ہے انتظار ہمیں

....

کون آیا یہاں امرت پی کر
زندگی ہے تو قضا لازم ہے

....

خواہشوں کا کمال کیا کہیے
خواب بھی قاتلانہ گزرا ہے

....

باغباں کی مرضی سے یہ رواج قائم ہے
تتلیاں پکڑلینا، پھول کو مسل دینا

فخرالدین عارفی، ڈاکٹر رفیق اعظم، پروفیسر کوثر مظہری، جنید میر اور شکیل اعظمی کی آرا صاحب سخن کے فکر وفن سے آگاہی فراہم کراتی ہیں مگر 'سخن ور' کا قلم اپنی شعری کائنات کی تشکیل کے حوالے سے 'خاموش' ہے۔ اسے یقینی طور پر فال نیک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک بات اور۔ حالیہ کئی کتب بالخصوص شعری مجموعوں میں 'گئے' کا جدید املا 'گیے' دیا گیا ہے جو درست نہیں۔ جب 'گیا' سے 'گئی'، 'گئیں' لکھا جاتا رہا ہے تو اسے تبدیل شدہ صورت دینے کا کیا مطلب ہے۔ ایسے الفاظ جن کے پہلے حرف پہ زیر ہو اُس میں ہمزہ نہیں لگایا جاتا۔ بطور مثال 'لیے، پیے، جیے' وغیرہ جبکہ پہلا حرف زبر ہو تو ہمزہ لازمی ہے۔ بطور اختتامیہ یہ اشعار قرطاس دل پہ سجا لیجیے:

شام کا دھندلکا ہے
غم ذرا سا چھلکا ہے
من بہت ہی بھاری تو
درد ہلکا ہلکا ہے
ماہ و سال گزرے ہیں
زخم جیسے کل کا ہے
جھوٹ اور سچ ہے کیا
راز ایک پل کا ہے

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔(سعودی عرب)
Mobile: +966598300320 ❑❑❑

شہرغزل

شاعر: ڈاکٹر شفیق اعظمی

صفحات: 208، قیمت: -/300، اشاعت: 2019
ناشر: ڈاکٹر شفیق اعظمی، سرائے میر، اعظم گڑھ-276305 (یوپی)

——— از: سعید اختر اعظمی☆

سلاست بیان، عام فہم الفاظ اور لہجے کی شیرینی گفتگو کو موثر بنادیتی ہے۔ سخن وری بھی ایسی گفتگو ہے جس میں حسن خیال اور ندرت افکار کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی کا اختصاص بھی سہل ممتنع ہے جس میں عمومی الفاظ کا استعمال کر کے اپنی بات بہ حسن وخوبی کہی جاتی ہے۔ یہ مرحلہ سہل نہیں، لیکن اتنا دشوار گزار بھی نہیں کہ اسے عملی طور پر برتا نہ جاسکے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے جو مقبولیت کی بنا پر 'اشعار شفیق' کی سند پا چکے ہیں:

مری وفاؤں کا دنیا یہ کیا صلہ دے گی
بہت کرے گی نیا زخم اک لگا دے گی
میں سنگ میل ہوں، پتھر نہیں ہوں رستے کا
کہ جب بھی چاہے گی دنیا مجھے ہٹا دے گی
دلوں کی شمع جلاتے چلو کہ اس کے سوا
چراغ جو بھی جلیں گے ہوا بجھا دے گی

'انداز غزل' (1994) کے چوبیس برس بعد منظر عام پہ آنے والا دوسرا سخن زاویہ 'شہر غزل' دو دہائی کے دوران ضبط تحریر میں لایا جانے والا کلام ہے۔ اس میں تقریباً دس درجن غزلوں کی شمولیت ہے جن میں سہل ممتنع کی روش اپنائی گئی ہے۔ ابتدا میں حمد ونعت کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے جو ثنائے الٰہی اور مدحت سرور عالم (ﷺ) کا اعلامیہ ہیں:

جز تیرے کوئی معبود نہیں
مولا تو کہاں موجود نہیں
ہر علم کا رکھنے والا ہے
کچھ تجھ سے کہاں پوشیدہ ہے

....

فضائے مدینہ ہے کیا اللہ اللہ
جدھر جاؤ خوشبو ہی خوشبو بسی ہے

اے بادصبا چل یہاں تو ادب سے
تجھے کچھ پتہ ہے یہ کس کی گلی ہے

'غزل رنگ' کے آہنگ میں انہوں نے روایتی موضوعات کوخوبصورتی سے برتاہے جس میں حالات حاضرہ اور سماجی ادراک نمایاں ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

وقت اک ایسا ہی مرہم ہے کہ انسانوں کے
زخم بھر دیتا ہے، گہرا نہیں ہونے دیتا

....

ہمارا فرض ہے ہم سائے کی خبر گیری
مگر یہ کام کوئی بھی یہاں نہیں کرتا

....

قبل اس کے کہ اندھیرا بڑھ جائے
لَو چراغوں کی بڑھادی جائے

رومان جزوفطرت ہے۔انسان ہراس شے میں کشش محسوس کرتا ہے جواسے متاثر کرتی ہے۔حسن جاناں ان میں فوقیت رکھتا ہے۔یہ اشعاراسی حوالے کومعتبر کرتے ہیں:

یہ گیسوؤں کی چھاؤں، یہ آنکھوں کا جل ترنگ
عارض تمام صبح کا منظر لیے ہوئے

....

اس کی فطرت ہے بکھیرے گا اجالا ہر سو
دل ہے سورج مرا، برسات کا جگنو تو نہیں

....

کیوں کسی اور کی طرف دیکھوں
کیا کوئی آپ سے بھی بڑھ کر ہے

....

دیس سے پردیس ہجرت ،اہل وعیال سے دوری، ضروریات کی تکمیل کے لیے جدوجہد اور یادوطن کو سینے سے لگائے خاک وطن سے ہم آغوش ہونے کی تمنا بھی شاعر کے یہاں اپنی تمام تر تمکنت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ اشعار پردیسی کے درد کا پرسوز بیانیہ ہیں:

مجبوریاں ہیں سامنے کرتا بھی کیا غریب
پردیس یونہی جاتا ہے گھر چھوڑ کر کوئی

سمجھا رہی ہے آج بھی یاد وطن مجھے
اے بدنصیب اپنے وطن سے جدا نہ ہو

'بیت آخر' کے طور پر یہ اشعار جس میں پندونصیحت بھی ہے اورحالات سے آگاہی بھی۔تاکہ سند رہے:

دل کی باتیں دل ہی میں رکھّا کرو
ہر کسی کو دوست مت سمجھا کرو
دوسروں میں عیب مت ڈھونڈا کرو
بن پڑے تو آئینہ دیکھا کرو
رات میں آسیب پھرتے ہیں تمام
شام ہو تو گھر چلے آیا کرو

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔(سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

رنگ سخن

شاعر: ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی
صفحات:200، قیمت:-/200،اشاعت:2022
ناشر:435/330، رجب گنج، ٹھاکر گنج، لکھنؤ-226003(یوپی)
Mobile: 9455551607

——از: سعید اختر اعظمی☆

لکھنؤ: دیارحسن وعشق،شہرلالہ زار، خانۂ شباب شعر، خطہ اہل علم اورشام اودھ کا معتبر حوالہ زبان وبیان کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔یہ ایسا رنگ روپ کا چمن ہے جہاں کا عطر بیز لہجہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔لکھنوی اردو کا جواب نہیں۔ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی اس حوالے سے کہتے ہیں:

سیکھی جو ماں سے ہم نے وہ اردو زبان ہے
اور شہر لکھنؤ کی یقیناً وہ جان ہے
تہذیب لکھنؤ کی الگ اپنی شان ہے
دنیا میں منفرد ہے جو اس کی زبان ہے

'سندیلہ' میں ان کا آبائی مکان ہے۔یوپی اردو اکادمی میں ملازمت کے سبب انہوں نے لکھنؤ میں ہی بودوباش اختیار کرلی۔

اس پر وہ اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

رہنے والا ہوں میں سندیلہ کا، یہ سچ ہے ،مگر
لکھنؤ میں بھی مکاں ہے، یہاں بے گھر تو نہیں

اسے وہ 'شہرِ سخن' کہتے ہیں اور یہاں کے انداز گفتگو سے خاصے متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہوا ہے جب سے ہمیں ذوق شعر گوئی کا
سخن کے شہر میں ،شاعر گروں میں رہتے ہیں

....

اُن کا لہجہ حسین ہے اتنا
گفتگو لکھنوی سی لگتی ہے

'رنگِ سخن' ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کا اولین 'سخن بیانیہ' ہے جس کی اشاعت میں ظہیر حسن ظہیر کے مشورے اور خواہش کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ عام فہم روایتی شاعری نعتوں اور غزلوں پہ مشتمل ہے۔ ابتدائی صفحات میں صاحب سخن کا 'سببِ تصنیف' اور 'دیباچہ' کے علاوہ عمیر منظر کا 'سعید سندیلہ' کتاب اور صاحب کتاب کا معتبر حوالہ ہے۔ سعید سندیلوی نے استاد سخن راہی پرتاپ گڑھی پہ لکھے گئے طویل مضمون (15 صفحات پہ مشتمل) میں اُن کے فکر وفن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نصف درجن سے زائد نعتوں میں حبِّ نبوی اور عقیدتِ مصطفیٰ کی جلوہ گری سامنے آتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ:

مفسر ہے جو قرآں کا، جو دانائے شریعت ہے
وہ کرسکتا ہے آقا کی حسیں سیرت کا اندازہ
وہ جا کر عرش سے آئے تو بستر گرم تھا اُن کا
کریں اہل نظر رفتار کی سرعت کا اندازہ

....

ہر اک نبی میں ایک نہ اک وصف تھا،مگر
ہر وصف ہے جناب رسالت مآب میں

....

یہ محبوب رب کا مقام اللہ اللہ
خدا خود ہوا ہم کلام اللہ اللہ

غزلوں میں پند ونصائح ،حالات حاضرہ اور رومان کی تنوع جہتی خوب ہے جو سادہ وسلیس زبان میں نیا لطف دیتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

تم نے لَو دیتی ہوئی رات نہ دیکھی ہوگی
چاندنی میں مرے گھر پہ یہ سماں ہوتا ہے

....

جب مہ و مہر کو دیکھا ہم نے
یار کے نقش قدم یاد آئے
مضطرب اور ہوا دل اپنا
بے سبب آپ کو ہم یاد آئے

....

آخری صفحات پہ چند ہزلیات پیش کی گئی ہے جن میں طنز کے شانہ بہ شانہ سنجیدگی بھی راہ پا گئی ہے۔ اسی طرح غزلوں میں حمد ونعت کے ساتھ مناقب کے اشعار بھی کثرت سے در آئے ہیں جو 'حرمت غزل' کو مجروح کرتے ہیں۔ یہ روش درست نہیں، ہر صنف کو اس کے رنگ میں برتنا چاہیے، دوسری صنف کا رنگ شامل کرنے سے 'آدھا تیتر آدھا بٹیر' بن جاتا ہے۔ بطور اختتامیہ دو اشعار:

ہم اہل جنوں ہیں ہمیں کیا کام کسی سے
لوگوں سے کبھی شکوہ شکایت نہیں کرتے
آنچ آنے نہیں دیتے کبھی اپنی انا پر
جذبات کی ہم لوگ تجارت نہیں کرتے

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔(سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

❑❑❑

اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں
'اردو بک ریویو' ملنے کا پتہ

Maktaba Islami
Opp. Bannemiyan Dargah
Nizamuddin Chowk,
Shahganj
Aurangabad - 431001 (M.S.)
Mobile: 9370229494

شخصیات

یادِ رفتگاں

اردو میں اقدار پر مبنی صحافت کے امین
پرواز رحمانی

[آمد: 8 جون 1948 — رخصت: 5 فروری 2026]

از: محمد عارف اقبال

اردو کے سینئر صحافی اور سہ روزہ دعوت کے سابق مدیر اعلیٰ پرواز رحمانی پیر 5 جنوری 2026 کو ساڑھے نو بجے شب میں انتقال کر گئے۔ وہ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر کے الشفا ہسپتال میں گزشتہ کئی ہفتوں سے زیر علاج تھے۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور داماد و نواسے نواسی شامل ہیں۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ ان کی تدفین دوسرے دن بعد نماز ظہر شاہین باغ قبرستان میں ہوئی۔

عبدالحق پرواز رحمانی اپنے قلمی نام پرواز رحمانی سے مشہور تھے۔ ان کی پیدائش اکولہ ضلع (مہاراشٹر) کے آکوٹ مقام پر 8 جون 1948 کو ہوئی۔ اپنے وطن میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہی تحریک اسلامی (جماعت اسلامی ہند) سے ذہنی طور پر وابستہ ہوئے اور صحافت کے ذوق کے سبب 1968 میں دہلی آئے جبکہ ان کی عمر ساڑھے بیس سال کے قریب تھی۔ روزنامہ دعوت جس کے مدیر اعلیٰ اس وقت معروف صحافی محمد مسلم (مرحوم) ہوا کرتے تھے، اسی زمانے میں دعوت کے مختلف شعبے میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔ انہوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کرنے کے بعد روہیل کھنڈ یونیورسٹی (یوپی) سے اردو میں ایم اے کیا۔ پریاگ راج یونیورسٹی سے ان کو 'ساہتیہ رتن' بھی ملا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے ڈپلومہ اِن جرنلزم کی سند بھی حاصل کی۔ وہ اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور مراٹھی سے بھی واقف تھے۔

ایمرجنسی کے دوران جب جماعت اسلامی پر بھی پابندی عائد ہوئی اور روزنامہ دعوت کی اشاعت بند کردی گئی تو انہوں نے عارضی طور پر روزنامہ پرتاپ جوائن کرلیا۔ ایمرجنسی کے بعد جب دعوت کی اشاعت بحال ہوگئی تو انہوں نے دعوت سے منسلک رہنا ہی مناسب خیال کیا اور دعوت کے سب ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دینے لگے۔

پرواز رحمانی تقریباً 30 سال سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر رہے۔ واضح ہو کہ محمد مسلم کے انتقال (3 جولائی 1986) کے بعد محفوظ الرحمٰن (و: 2010) اور ان کے بعد عربی اخبار الدعوہ کے مدیر (مولانا) سلمان ندوی، سہ روزہ دعوت کے مدیر ہوئے۔ سلمان ندوی کے انتقال کے بعد 1989 میں پرواز رحمانی سہ روزہ دعوت کے مدیر مقرر ہوئے۔ سینئر صحافی اے یو آصف اپنے تعزیتی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دعوت کے نشو ونما میں ایڈیٹر اصغر علی عابدی کا کردار سب سے اہم اور قابل ذکر ہے۔ دعوت سہ روزہ ہو یا ہفت روزہ اس کا مستقل کالم 'خبر ونظر' انہی کا شروع کیا ہوا ہے جسے ان کے بعد محمد مسلم، محفوظ الرحمٰن، سلمان ندوی اور عبدالحق پرواز رحمانی نے مستقل برقرار رکھا۔ کسی بھی زبان کی صحافت کی تاریخ میں 75 برس سے زائد عرصہ سے جاری مخصوص کالم کا یہ شاید انوکھا تجربہ ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ اصغر علی عابدی کے بعد دعوت کے دیگر مدیران میں محمد مسلم کے دور میں 'خبر ونظر' کے اس کالم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ اے یو آصف کے مطابق اس کالم میں تحریکی رنگ پہلے ایڈیٹر اصغر علی عابدی اور پھر اس کے پانچویں ایڈیٹر پرواز رحمانی کے یہاں سب سے زیادہ غالب رہا۔ لیکن 7 جولائی 2019 کو پرواز رحمانی کی ادارت میں سہ روزہ دعوت بند ہونے کے بعد ہفت روزہ میں یہ کالم جاری رہا مگر پالیسی کے اعتبار سے صرف اس کالم میں ہی نہیں بلکہ پورے اخبار میں تحریکی رنگ عنقا ہونے لگا۔

پرواز رحمانی جماعت اسلامی ہند کے باضابطہ رکن 1985 میں بنے۔ اگرچہ ان کا فکری تعلق جماعت سے 17 سال کی عمر ہی سے استوار ہو گیا تھا۔ اردو صحافت میں تقریباً 58 سال اپنی خدمات انجام دینے والے پرواز رحمانی کسی زمانے میں کہانیاں بھی لکھتے تھے اور انہوں نے شاعری بھی کی۔ تاہم 1962 سے ان کی کہانیاں اردو ٹائمز ممبئی اور غنچہ میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اے یو آصف لکھتے ہیں:

''اولین امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے ایما پر 1969 میں مرکز جماعت (واقع چتلی قبر، دہلی6) آ گئے تھے اور پھر ان کی ہدایت پر سہ روزہ دعوت جوائن کیا۔ 1969 سے 1989 تک معاون مدیر رہے اور 1989 سے 2009 تک مدیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کی عمر آ جانے پر ان کی زبردست فنی، فکری و تحریکی صلاحیت کے اعتراف میں انہیں مدیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ یہ اس اخبار میں پہلا تجربہ تھا۔''

سہ روزہ دعوت کے مدیر اُس وقت شفیق الرحمٰن تھے اور مدیر اعلیٰ پرواز رحمانی۔ پرواز رحمانی جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ وہ بطور صحافی پریس کلب آف انڈیا کے بھی رکن تھے۔ ان کی ادارت میں تحریکی، سیاسی، مذہبی، ملّی اور سماجی موضوعات پر سہ روزہ دعوت کے 42 سے زائد وقیع خاص نمبر شائع ہوئے۔ ان میں ہندوستانی مذاہب، ہندتو: ایک مطالعہ، عالمی مذاہب، مسلم دنیا: ایک نظر میں، مسلم مسائل: آزادی کے بعد، دہشت گردی، اسلام اور غلط فہمیاں، جہاد، مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام جیسے عنوانات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان شماروں میں 1999 میں جماعت اسلامی کے 50 سال پورے ہونے پر اور 2009 میں جماعت اسلامی ہند کے 60 برس پر تاریخی دستاویز شامل ہیں۔

اے یو آصف اپنے مضمون میں پرواز رحمانی کی تحریکی صحافت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پرواز رحمانی کی صحافت کے تحریکی رخ کو سمجھنے کے لیے یہاں سہ روزہ دعوت کے 'خبر و نظر' کے تحت ایک بدھ دانشور کی باتیں اور آر ایس ایس کے سابق سرسنگھ چالک کے ایس سدرشن کی وفات کے بعد لکھے گئے تاثراتی مضمون کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ دونوں تحریریں بہت مقبول ہوئی تھیں۔ بدھ دانشور لاما دوبوم تولکو نے خود اس کالم کی پذیرائی کی تھی۔''

اے یو آصف مزید لکھتے ہیں:

''پرواز رحمانی کی صحافتی مقبولیت اور معیار کا یہ حال تھا کہ خود اٹل بہاری واجپئی بھی اس کے معترف تھے۔ وزارت عظمیٰ کے دور میں ایک بار انہوں نے اپنے سکریٹری سے مسلم ایشوز پر اظہار خیال کے لیے کسی معروف اردو اخبار سے انٹرویو دینے کی خواہش کی تو جب ان کے پاس متعدد اخبارات کی فہرست پیش کی گئی تو انہوں نے برجستہ سہ روزہ دعوت کے مدیر اعلیٰ پرواز رحمانی کا نام لیا اور کہا کہ فہرست میں اس اخبار اور اس کے ایڈیٹر پرواز رحمانی کا نام کیوں نہیں ہے اور پھر جب پرواز رحمانی تک سودھندر کلکرنی پرواز صاحب کے پاس واجپئی کی فرمائش لے کر گئے تو ابتدا میں انہیں کچھ تکلف ہوا، لیکن واجپئی جی کی خواہش کے احترام میں انہوں نے کافی لمبا انٹرویو دیا اور انٹرویو شائع ہونے پر اس سے بہت مطمئن بھی ہوئے۔ اس واقعہ سے پرواز رحمانی کی معیاری صحافت کا اندازہ ہوتا ہے۔''

ملت اکیڈمی، بجنور کے چیئرمین اور ماہنامہ 'بچّوں کا ساتھی' کے مدیر ڈاکٹر سراج الدین ندوی اپنے تعزیتی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''فکری سطح پر ان کے اداریوں میں دینی شعور اور عصری آگہی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ مسائل کو صرف جذباتی یا مذہبی زاویے سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ سماجی، سیاسی اور انسانی تناظر میں بھی پرکھتے تھے۔ اس لیے ان کے اداریے عام قاری کے ساتھ ساتھ اہل علم کے لیے بھی توجہ کا مرکز بنتے تھے۔''

سہ روزہ دعوت کے سابق مدیر شفیق الرحمٰن نے اپنی ایک تعزیتی تحریر میں، پرواز رحمانی سے اپنی 29 سالہ رفاقت (1990 تا 2019) کی بنا پر کتاب زندگی کے چند اوراق کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی تحریر میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''فرد کی پہچان فکر سے قائم ہوتی ہے، فکر سے ہی اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے، اسے اعتبار حاصل ہوتا ہے اور انفرادیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ بات ادنیٰ تامل و تردد کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ قبلہ پرواز رحمانی صاحب ایک صاحب فکر و نظر انسان اور صاحب بصیرت شخص تھے۔ جس کسی سے بھی ان

کا سروکار (تعلق) تھا اس کے بارے میں وہ فکرمند اور بے چین رہتے تھے۔ انسان اگر حساس ہوتو وہ گرد و پیش پر نہ یہ کہ نظر رکھتا ہے بلکہ وہ اس کے بارے میں ایک رائے (نقطہ نگاہ) بھی قائم کرتا ہے اور اگر اس کی رگوں میں گرم خون بھی دوڑ رہا ہوتو جس کو صائب رائے سمجھتا ہے اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ گرد و پیش کو اس رائے کے موافق ہموار کرنے کی کوشش سے بھی نہیں چوکتا۔''

شفیق الرحمٰن اپنی تحریر میں آگے لکھتے ہیں:

''قبلہ پرواز رحمانی صاحب کی دعوت کے سلسلے میں ایک رائے تھی۔ وہ اسے ملت کا اثاثہ اور اُمت کا نقیب و ترجمان دیکھنا چاہتے تھے اس لیے اسے اسی رنگ میں پیش کرنے کے قائل تھے۔ وہ اسے ملت اور اُمت کی آواز بنانے کے خواہاں تھے، جس نظریاتی گروہ یعنی جماعت اسلامی ہند کے ساتھ وہ منسلک تھے، اس کے بارے میں بھی ان کا یہ خیال تھا کہ اس کی نظریاتی بنیادوں کو ہمیشہ تندرست اور توانا رہنا چاہیے، غالباً اسی بنا پر وہ یہاں کارپوریٹ کلچر کو رواج دینے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ تنظیم کے داخلی مسائل اور صورت حال پر بھی ان کی اپنی ایک رائے تھی، اسی طرح زیردستوں کے مسائل اور معاملات سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے حقوق پامال نہیں ہونے چاہئیں۔''

پرواز رحمانی نے جس کالم 'خبر ونظر' کو اپنے دور ادارت میں اپنی معلومات و تجزیاتی اسلوب سے توانا رکھا، ان کے کالم کا مجموعہ 'خبر ونظر' 1996 میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں 1989 سے 1996 تک کے مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب پر مسٹر اے یو آصف کا 'اردو بک ریویو' (شمارہ اکتوبر تا دسمبر 1996) میں نقد و تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ان کی دو مزید کتابیں 'ہندوستانی مسلمان' اور 'اسلام اور مغربی چیلنج' منظرعام پر آئی تھیں۔ پاکستان میں بھی یہ دونوں کتابیں شائع ہوئیں۔

'اردو بک ریویو' (شمارہ جنوری تا مارچ 2010) میں پرواز رحمانی کا ایک مختصر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ ''آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟'' تو موصوف کا جواب تھا ''نئی نسل کی کردارکشی۔''

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو شرف قبولیت بخشے اور درجات کو بلند کرے۔ آمین!

❑❑❑

بقیہ صفحہ 96 سے آگے

رسائل و جرائد: خصوصی اشاعت

اذکار، سہ ماہی ادبی وتہذیبی مجلّہ، ایڈیٹر: ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن، اکتوبر تا دسمبر 2025، صفحات 308، قیمت -/200، راجسٹرار کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور

بندگی ربّ، ماہنامہ، ایڈیٹر: محمد رشاد رفعت، جنوری فروری 2026، صفحات 64، سالانہ -/350، D-195 سکنڈ فلور، AFE، نئی دہلی۔ M: 8750488985

پیش رفت (اقبال نمبر)، ڈاکٹر حسن رضا، ڈاکٹر خالد مبشر، نومبر دسمبر 2025، صفحات 130، سالانہ -/400، D-21، AFE، نئی دہلی۔ M: 8595650280

جہانِ اردو، ماہنامہ (دبستانِ عظیم آباد نمبر، حصہ اوّل)، ایڈیٹر: پروفیسر مشتاق احمد، جلد 25، شمارہ 100، اکتوبر تا دسمبر 2025، صفحات 344، سالانہ -/1000،

جہانِ اردو، ماہنامہ (دبستانِ عظیم آباد نمبر، حصہ دوم)، ایڈیٹر: پروفیسر مشتاق احمد، جلد 26، شمارہ 101، جنوری تا مارچ 2026، صفحات 195، سالانہ -/1000،

پتہ: رحم گنج، دربھنگہ -846004 (بہار)۔ موبائل: 9431414586

دبستانِ نعت (کتابی سلسلہ 10)، ایڈیٹر: ڈاکٹر سراج احمد قادری، جنوری تا دسمبر 2025، صفحات 536، قیمت -/500،

پتہ: نعت ریسرچ سنٹر، انڈیا، خلیل آباد (یوپی)۔ M: 9415875761

دربھنگہ ٹائمز، سہ ماہی (پیارا بچپن۔1) گوشہ قاسم خورشید، ایڈیٹر: ڈاکٹر منصور خوشتر، جولائی 2025 تا مارچ 2026، صفحات 520، قیمت -/500،

پتہ: ڈاکٹر منصور خوشتر، دربھنگہ -846004 (بہار)۔ موبائل: 9234772764

زیست (کتابی سلسلہ 23)، ایڈیٹر: پروفیسر ڈاکٹر سیّد یونس حسنی، تزئین راز زیدی، دسمبر 2025، صفحات 201، قیمت -/1000،

پتہ: R-1/121 فیڈرل بی ایریا، بلاک 1، کراچی۔ (پاکستان)

شگوفہ (سالنامہ)، ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال، جنوری فروری 2026، صفحات 72، سالانہ -/400، مصعب ٹینک، حیدرآباد۔ M: 9885202364

❑❑❑

خراج عقیدت

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○ [بنی اسرائیل:۸۱]

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

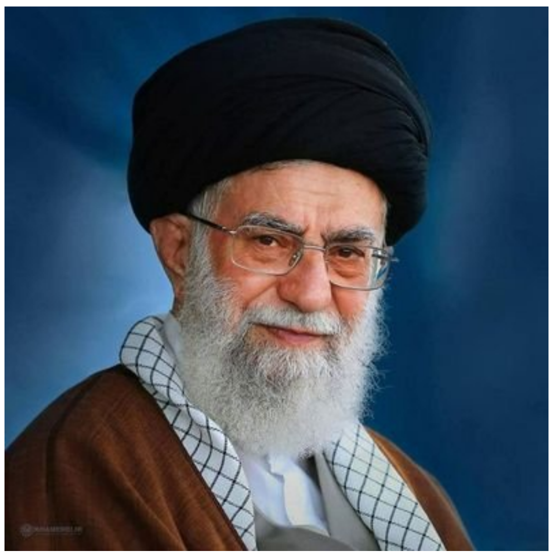

اگر میں شہید ہو گیا تو رونا نہیں خوش ہونا، کیونکہ ہم لڑ کر شہید ہو رہے ہیں، میری فوج اور میرے عوام بھی لڑ کر شہید ہو رہے ہیں، ہمیں یہودیوں اور امریکیوں کے سامنے نہ جھکنا ہے نہ ہی امریکہ سے مدد مانگنی ہے، تاکہ میں آخرت میں اس حالت میں جواب دے سکوں کہ میں اسلام کے لیے لڑا تھا، کسی طاقت کے سامنے جھکا نہیں تھا

آیت اللہ علی خامنہ ای

(تاریخ پیدائش: 19 اپریل 1939 —— شہادت: یکم مارچ 2026)

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

سیّد شاہد مہدی

(سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (سنٹرل یونیورسٹی) کے سابق وائس چانسلر سیّد شاہد مہدی سنیچر کی دیر رات 21 دسمبر 2025 کو وسنت کنج، نئی دہلی میں واقع اپنی رہائش گاہ پر انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ ایک عرصہ سے علیل تھے اور ڈاکٹر کے مشورے سے وہ مکمل آرام کر رہے تھے۔ نماز جنازہ جامعہ کی جامع مسجد میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی اور تدفین جامعہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مارچ 2020 میں سیّد شاہد مہدی کی اہلیہ بیگم نکہت مقبول کا انتقال ہو گیا تھا۔

سیّد شاہد مہدی 1939 میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک باوقار شیعہ گھرانے سے تھا۔ ان کا وطنی تعلق اتر پردیش کے غازی پور کے ایک گاؤں گنگولی سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گنگولی کے مشراجی کی پاٹھ شالا میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ملازمت کے سبب مختلف شہروں کا سفر کرتے ہوئے علی گڑھ آ گئے تھے۔ اس لیے ان کی علمی و ادبی ذوق کی آبیاری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی صحبت میں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ اور سیاسیات میں ماسٹر کی ڈگری لی تھی۔ ان کی شخصیت میں شائستگی اور اخلاق کا بہترین امتزاج تھا۔ گفتگو میں ٹھہراؤ تھا اور انداز تخاطب دل نشیں ہوتا تھا۔ ان کا علمی و ادبی شعور بہت بلند تھا۔ وہ اپنی مادری زبان اردو کے عاشق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اور سیاسیات میں ڈگری لینے کے باوجود انہوں نے اے ایم یو کے شعبہ اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے احباب میں شامل کیا تھا۔ ان میں آل احمد سرور، احتشام حسین، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، راہی معصوم رضا اور شہر یار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سیّد شاہد مہدی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ علی گڑھ اور کورکشیتر میں درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ 1963 میں جب انہوں نے انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس (IAS) کا امتحان دیا تو اس وقت بھی وہ کورکشیتر کے ایک کالج میں لکچرار تھے۔ آئی اے ایس میں کامیابی کے بعد وہ بہار کیڈر کے لیے منتخب کیے گئے۔ بہار میں انہوں نے کئی اضلاع میں انتظامی امور سے متعلق خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ مرکزی وزارت برائے فرٹیلائزر میں کمشنر بھی رہے۔ ان کی دلچسپی کے موضوعات میں فائن آرٹ کے ساتھ تعلیم اور ماحولیات شامل تھے۔ لیکن اپنی زندگی میں انہوں نے 'ادب' کو خاص اہمیت دی اور اپنا خاص تعلق اردو اور فارسی زبان سے قائم رکھا۔ شاید چند ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ سیّد شاہد مہدی ابن صفی کے ناولوں کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے ابن صفی کے ہر ناول کا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذہنی کینویس بے حد وسیع تھا۔ بات دسمبر 2012 کی ہے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ (شعبہ اردو) اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے ہندوستان میں پہلی بار ابن صفی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک کُل ہند سہ روزہ سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار کا افتتاح اس وقت کے وائس چانسلر نجیب جنگ نے کیا تھا اور کلیدی خطبہ پروفیسر مظفر حنفی نے پیش کیا تھا۔ اس سمینار میں تینوں دن سیّد شاہد مہدی بطور مشاہد شریک تھے۔ انہوں نے غالباً سمینار کے دوسرے دن راقم کا ہاتھ پکڑ کر دریافت کیا تھا کہ اب کتنی جلدیں ترتیب ہونے سے رہ گئی ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ ممکن ہے کہ سات آٹھ جلدیں اور شائع ہوں تب ابن صفی کلیات مکمل ہو جائے گی۔ سیّد شاہد مہدی نے بتایا کہ ان کے پاس ہماری مرتب کردہ تمام جلدیں موجود ہیں۔ غالباً 53 جلدیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا کہ ''آپ نے ابن صفی کی تحریروں کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے، جو بڑا کارنامہ ہے۔''

معروف اردو صحافی معصوم مرادآبادی نے سیّد شاہد مہدی پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے:

''یوں تو سیّد شاہد مہدی نے تمام عمر ہی سرکاری ملازمت میں گزاری لیکن انہیں جو مقبولیت اور ہر دل عزیزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کے طور پر حاصل ہوئی، وہ کہیں اور

نہیں مل سکی۔ انہوں نے 2000 سے 2004 تک جامعہ کے گیارہویں وائس چانسلر کے طور پر خدمات انجام دیں اور وہاں سے سبکدوشی کے بعد مولانا آزاد کے قائم کردہ ثقافتی ادارے انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز (ICCR) سے بطور نائب صدر وابستہ رہے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد وہ گھر نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے خود کو دہلی کی علمی، ادبی اور سماجی زندگی کا ایک لازمی حصہ بنالیا۔''

سیّد شاہد مہدی انتہائی کثیر المطالعہ تھے۔ وہ ابن صفی کے ناولوں کو بھی پڑھتے اور 'ادب عالیہ' کے مطالعہ سے بھی فیض یاب ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی اور ادبی ذوق کو دیکھ کر غالب اکیڈمی، ایوانِ غالب اور دہلی اردو اکادمی کے پروگراموں کی صدارت بھی ان کو سونپی جانے لگی۔ انہوں نے ملازمت کے دوران میں جن ملکوں کا سفر کیا ان میں امریکہ، انگلینڈ، فرانس، بلجیم، جرمنی، اسپین، اٹلی، سوئٹزرلینڈ کے علاوہ روس، چین، تھائی لینڈ، سنگاپور، ملیشیا، سری لنکا، مصر، مراقش، سعودی عرب، ایران اور افغانستان شامل ہیں۔ معصوم صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''سیّد شاہد مہدی نے 2008 میں علی گڑھ کے ابن سینا اکیڈمی میں ایک یادگار خطبہ پیش کیا تھا جسے ابن سینا اکیڈمی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اس یادگاری خطبہ کا عنوان تھا ''مغرب، اسلام اور مسلمان۔'' اندازہ کیجیے کہ اس اہم موضوع پر سیّد شاہد مہدی کی شخصیت کو ہی اس موضوع پر خطبہ دینے کے لیے کیوں منتخب کیا گیا۔ اندازہ کرنا شاید مشکل نہیں کہ سیّد شاہد مہدی کی دانشورانہ فکری بلندی دراصل ان کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھی۔ اردو میں جاسوسی فکشن کے معمار کی تحریروں سے ان میں فکری ہم آہنگی بڑی حد تک پیدا ہوگئی تھی۔ ابن صفی نے اپنے ایک ناول 'پاگلوں کی انجمن' (یکم جون 1970) کے 'پیش رس' میں لکھا تھا:

''قرآن کو پڑھو، اس پر عمل کرو... اسے علم الکلام کا اکھاڑہ نہ بناؤ۔ جن طبقے کے تم شاکی ہو اس کی اصلاح کی سوچو۔ ظلم و تشدد کا تصور تک ذہن میں نہ لاؤ... ہمیشہ یاد رکھو، تم اس کے غلام ہو جس کی مظلومیت انقلاب لائی تھی (یاد کرو طائف کا وہ واقعہ جب میرے آقا و مولا کی جوتیاں لہولہان ہوگئی تھیں) اس سے زیادہ اس سلسلہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحوم سیّد شاہد مہدی کی مغفرت فرمائے اور ان کے حسنات کو شرف قبولیت عطا کر کے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

پروفیسر محمد ذاکر (محقق، ادیب و نقاد)

معروف محقق و ادیب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر کا اتوار 28 دسمبر 2025 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 90 برس سے زائد تھی۔ پس ماندگان میں سات بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں، جبکہ اہلیہ کا انتقال پہلے ہی ہوچکا تھا۔ ان کی نماز جنازہ اور تدفین سوگواروں کی موجودگی میں دہلی کے مہندیان قبرستان میں عمل میں آئی۔

پروفیسر محمد ذاکر نے اینگلو عربک اسکول، سینٹ اسٹیفن کالج آف کامرس اور ذاکر حسین دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بطور استاد وابستہ ہوئے، جہاں وہ شعبہ اردو کے صدر بھی رہے اور اسی ادارے سے بحیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر ذاکر تقریباً 40 سال جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بحیثیت استاد اردو زبان و ادب سے وابستہ رہے۔ ترجمہ، اردو لسانیات اور ادبی تنقید ان کی دلچسپی کے موضوع رہے۔

حیرت ہے کہ پروفیسر محمد ذاکر کے انتقال (28 دسمبر 2025) کی ایک چھوٹی سی خبر تو شائع ہوئی لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے شاید ہی کوئی قابل ذکر مضمون شائع ہوا ہو۔ ذاکر مرحوم کے رفقا اور شاگردوں میں سے بھی کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔ البتہ ایوانِ اردو دہلی (فروری 2026) میں عبدالعزیز (سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر ذاکر حسین دلّی کالج) کا ایک مختصر معلوماتی مضمون شائع ہوا۔ عبدالعزیز صاحب اپنے مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

''...28 دسمبر 2025 کی منحوس صبح برادرم عبدالرشید کا فون آیا کہ ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دوپہر پونے دو بجے منہدیان میں تدفین ہوئی۔ ذاکر صاحب یادوں کا حصہ بن گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!''

پروفیسر محمد ذاکر کی بیٹی راشدہ سلطانہ کی ایک مختصر تحریر روزنامہ انقلاب (25 جنوری 2026) میں شائع ہوئی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ان کو (پروفیسر محمد ذاکر) تقسیم ہند کا آخری وقت تک افسوس رہا۔ کہتے تھے اگلے دوسو سال تک بھی اس کے نقصانات کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ حقیقت میں اپنی تعلیمی زندگی کے پہلے دن سے علم حاصل کرنے اور پھر اس کی سچائی اور گہرائی جاننے میں جو سرور و نشاط ان کو حاصل ہوتا تھا، اس کے مقابل میں ان کی زندگی کے دوسرے مزے اور ساری شہرت ہیچ نظر آتی تھی۔ علم کی حقیقت کی جستجو نے ان کو گوشہ نشین بنا دیا تھا۔''

پروفیسر محمد ذاکر کی تصانیف وتراجم میں پی ایچ ڈی کا مقالہ 'آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب' (مکتبہ جامعہ)، 'خواجہ حیدر علی آتش' (ساہتیہ اکیڈمی)، 'انتخاب غزلیات آبرو مع مقدمہ' (اردو اکادمی دہلی) قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر محمد ذاکر کو مجموعی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی دہلی نے دہلی والوں کے لیے مخصوص پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ پیش کیا۔ ان کی تصانیف وتراجم پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے انعامات ملے۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے انہیں ایوارڈ برائے تنقید وتحقیق بھی تفویض کیا گیا۔ ان کو غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کی طرف سے انعام برائے اردو نثر بھی دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی یہ کاوشیں قبول فرمائے اور بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

ڈاکٹر منظور احمد (فلسفی، سائنس داں)

پاکستان کے مایہ ناز فلسفی، ماہر تعلیم اور اسلامی علوم کے عالم ڈاکٹر منظور احمد پیر 22 دسمبر 2025 کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 94 سال تھی۔ ڈاکٹر منظور احمد پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ فلسفی اور پاکستانی فلاسوفیکل کانگریس (PPC) کے سابق صدر تھے۔ ان کا شمار صف اول کے ماہر تعلیم اور بڑے دانشوروں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے ذہین طالب علم اور Debater رہے۔ تعلیمی کریئر میں ہمیشہ اوّل پوزیشن لیتے رہے۔ ان کا شمار پاکستان کے اسلامی جمعیت طلبا کے قائدین میں ہوتا ہے جن میں ظفراللہ خاں، پروفیسر خورشید احمد، خرم مراد، اور ڈاکٹر اسلم (ماہر امراض قلب) وغیرہ شامل تھے۔ جس زمانے میں (غالباً 1955) پروفیسر خورشید احمد جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے تو ڈاکٹر منظور احمد اس کے معتمد عام (سکریٹری جنرل) رہے۔

ڈاکٹر منظور احمد 11 مارچ 1934 کو رام پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور میٹرک کے امتحان میں پوری ریاست میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ انہیں ابتدا ہی سے فلسفہ سے دلچسپی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی کے سندھ مسلم آرٹس کالج سے بی اے کیا۔ 1951 میں جامعہ کراچی میں داخل ہوئے تو طبعیات، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی اور فزکس میں بی ایس سی (آنرس) کے بعد انہوں نے فلسفہ میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1955 میں کراچی یونیورسٹی سے فلسفہ میں بھی ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے اسکالرشپ پر یونیورسٹی آف لندن میں ڈاکٹریٹ کا پروگرام بنایا۔ ڈاکٹر منظور احمد نے طبعیات (فزکس) میں دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے فلسفہ سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، جس میں ان کی تحقیق خلا اور وقت (Space and Time) کے تسلسل کے ریاضیاتی اور فلسفیانہ تصورات پر مرکوز تھی۔ اس کے بعد پاکستان واپس آکر سب سے پہلے کراچی یونیورسٹی میں تدریس شروع کی۔ وہ شعبہ فلسفہ کے پہلے سربراہ اور بعد ازاں فیکلٹی آف فائن آرٹس کے ڈین مقرر ہوئے۔ وہ پاکستان میں کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کے رکن بھی رہے۔ فلبرائٹ اسکالر کی حیثیت سے پروفیسر منظور احمد نے یونیورسٹی آف شکاگو، کولمبیا یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں فلسفۂ سائنس پر لکچرز دیے۔ ان کو براؤن فاؤنڈیشن اور برٹش کونسل سے بھی فیلوشپس (Fellowships) دی گئیں۔

لندن میں پی ایچ ڈی کرنے کے دوران میں فلسفہ اور سماجیات کے گہرے شغف نے ڈاکٹر منظور احمد کو علامہ سیّد مودودیؒ کے اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے تعبیر کرنے سے اختلاف بھی ہوا۔ فلسفہ اور منطق میں نظام کا جو مطلب ہوتا ہے

اسے اسلام پر منطبق کرنا منظور احمد کے نزدیک درست نہیں تھا۔ اس نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ اپنے جمعیت کے دور کے ساتھیوں پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر اسرار احمد اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری وغیرہ سے دیرینہ تعلقات کا پاس رکھتے تھے۔ ڈاکٹر منظور احمد جب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ریکٹر تھے تو برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی یونیورسٹی آمد پر انہوں نے پروفیسر خورشید احمد کو خصوصی ملاقات اور گفتگو کے لیے مدعو کیا تھا۔ اسی طرح وہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری اور ڈاکٹر اسرار احمد سے بھی نیاز مندانہ احترام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو اپنے گھر کھانے پر بھی مدعو کیا تھا اور قرآن اکیڈمی میں ڈاکٹر اسرار احمد (مرحوم) کی طرف سے عشائیہ میں بھی ڈاکٹر منظور احمد تشریف لے گئے تھے۔ ڈاکٹر منظور احمد اپنے دور کے ایک بڑے صوفی اور فلسفی بابا ذہین شاہ تاجی سے بھی متاثر تھے۔ ان کی صوفیانہ محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے دو بار ہمدرد یونیورسٹی (کراچی) کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔ انہوں نے اِنڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر (IVS) کے بورڈ آف گورنرس کے چیئرمین کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں ڈاکٹر منظور احمد اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے۔ ان کا نمایاں علمی کام فلسفہ، سائنس اور انسانی شعور کے باہمی تعلقات کی گہری تفہیم پر مرکوز رہا ہے۔ خصوصاً خلا اور وقت (Space & Time) کے فلسفیانہ مباحث میں ان کی خدمات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد بڑے وسیع النظر تھے اور اپنے دوستوں کے ساتھ بڑی مروت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ان کی اختلافی باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ زندگی کے آخری چند ماہ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ نسیان کے مرض نے شدید نوعیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن انتقال سے قبل وہ بالکل ہوش میں تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں سے بہت سی باتیں کیں جس سے ان کو محسوس ہوا کہ منظور احمد پر کبھی بھی نسیان کی کیفیت طاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسی حالت میں ان کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔

اللہ رب العزت ان کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦

(عارف الحق عارف، فالسم، کیلی فورنیا، امریکہ کے طویل مضمون سے ماخوذ)

ڈاکٹر محمد منظور عالم

(انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکیٹیو اسٹڈیز کے روح رواں)

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکیٹیو اسٹڈیز (IOS) کے بانی سابق چیئرمین اور روح و رواں ڈاکٹر محمد منظور عالم منگل 13 جنوری 2026 کی صبح طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ وہ ملک کے معروف دانشور، ماہر اقتصادیات اور آل انڈیا ملّی کونسل کے جنرل سکریٹری تھے۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ، پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب شاہین باغ (جامعہ نگر) قبرستان میں کی گئی۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم 9 اکتوبر 1945 کو صوبہ بہار کے مدھوبنی ضلع کے ایک گاؤں رانی پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے انہوں نے اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فراغت کے بعد وہ سعودی عرب (ریاض) کے منسٹری آف فنانس اینڈ نیشنل اکانومی میں بطور اقتصادی مشیر مقرر ہوئے۔

امام محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر، کنگ فہد ہولی قرآن پرنٹنگ کمپلیکس (مدینہ منورہ) میں دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کے چیف کوآرڈی نیٹر، ہندوستان میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ملیشیا (IIUM) کے نمائندے، اسلامک ڈیولپمنٹ بینک (IDB) اسکالر شپ پروگرام برائے غیر رکن ممالک کی جنرل کمیٹی کے رکن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے مسلسل دو مرتبہ ممبر رہے۔ وہ فی الوقت انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (I.I.I.T) امریکہ کے بورڈ ممبر، انٹرنیشنل اسلامک چیری ٹیبل آرگنائزیشن کویت کے بانی ممبر، اسٹیئرنگ کمیٹی استنبول مذاکرات، سول

سولیڈیریٹی پلیٹ فارم استنبول (ترکیہ) اور ایمننٹ پرسنز گروپ آف ورلڈ اسلامک فورم (ترکیہ) کے ممبر تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) نئی دہلی کے بانی چیئرمین اور سرپرست اعلیٰ، تعاون ٹرسٹ (نئی دہلی) کے چیئرمین، آل انڈیا ملّی کونسل کے جنرل سکریٹری، انڈو عرب اکنامک کوآپریشن فورم (نئی دہلی) کے صدر، انڈین ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹ (نئی دہلی) کے صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے رکن، بورڈ آف ٹرسٹیز، قومی کمیٹی برائے قانونی ازالہ وانصاف (NCLR) کے رکن، ہندوستان اور بیرون ملک ایک درجن سے زائد دیگر تنظیموں اور اداروں کے منیجنگ ڈائرکٹر اور ممبر تھے۔ مرحوم کو بین الاقوامی علمی دنیا میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ وہ سعودی عرب سے شائع ہونے والے امریکن جرنل آف اسلامک سوشل سائنسز (MEDAD) کے انٹرنیشنل ایڈوائزری بورڈ کے ممبر تھے، کویت سے شائع ہونے والے جریدے المنہاج کے انٹرنیشنل ایڈوائزری بورڈ کے ممبر اور مالدیپ یونیورسٹی کے بین علومی ریسرچ جرنل کی مجلس مشاورت کے بھی ممبر تھے۔

ڈاکٹر منظور عالم نے ہندوستان میں 1986 میں ایک ملّی و تحقیقی ادارہ آئی او ایس (Institute of Objective Studies) کی بنیاد رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ادارہ ان کے فکری خواب کی تعبیر تھا۔ اس لیے بعد میں اس ادارہ کو 'تھنک ٹینک' بھی کہا جانے لگا۔ اسی طرح انہوں نے 1992 میں قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کے ساتھ آل انڈیا ملّی کونسل کی بنیاد رکھی۔ ان کے انتقال کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے روزنامہ انقلاب (15 جنوری 2026) لکھتا ہے:

''ڈاکٹر منظور عالم کی فکر کا منبع اسلام تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملک کے آئین کو بھی خاص اہمیت دیتے تھے۔ نیز ان طبقات کے یکساں حقوق کی وکالت کرتے تھے جو سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر حاشیے پر تو تھے ہی مزید کنارے کردیے گئے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا 'نیشن ہمیشہ نیریشن (بیان) پر قائم ہے۔ نیریشن ہمیشہ آواز دیتا ہے پوچھتا ہے کہ آئین کیا کہہ رہا ہے۔ اگر نیریشن رُکا تو آواز دَب جائے گی اور آواز دب گئی تو ناممکن ہے کہ آئین جمہوریت کے ساتھ برقرار رہے۔' یہ جملہ اُن کی سوچ کے محور کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں، دلتوں، پس ماندہ طبقات اور دیگر کو نیریشن کی سوغات دینے کے مقصد ہی سے یہ ادارہ قائم کیا تھا جس نے کئی عنوانات پر تحقیق کو راہ دی۔''

پروفیسر طاہر محمود نے بھی 'خراج عقیدت' (انقلاب، 15 جنوری 2026) پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دعا اور دلی تمنا تو بس اب یہی ہے کہ ان کا ادارہ قائم ودائم رہے اور ان کے متعلقین و احباب ان کی علمی وراثت کو محفوظ رکھتے ہوئے اسے مزید ترقی دے کر ان کی پاکیزہ روح کی تسکین وتمکنت کا سامان کریں اور عنداللہ ماجور ہوں۔''

ڈاکٹر محمد ذوالفقار عالم علیگ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد منظور عالم صرف ایک ممتاز دانشور اور عظیم ادارہ ساز ہی نہیں تھے بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی شعور، فکری اعتدال اور وحدت اُمت کے نہایت معتبر امین تھے۔ ان کی پوری زندگی علم، تحقیق اور تعمیری و ملّی خدمات کے لیے وقف رہی اور ان کا ہر قدم دوراندیشی اور فہم زمانہ کی روشن مثال تھا۔

ہمارے درمیان ڈاکٹر محمد منظور عالم نہیں ہیں۔ لیکن ان کو جاننے کے لیے ان کی سوانح حیات موجود ہے۔ سب سے پہلے اردو میں یہ کتاب 'ڈاکٹر محمد منظور عالم: ان کہی کہانی' (انصاف، شمولیت اور برابری کی جدوجہد) کے نام سے 2024 میں شائع ہوئی۔ کتاب کے بائیوگرافر سینئر جرنلسٹ اور مصنف اے یو آصف ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن بھی مسٹر اے یو آصف نے تیار کیا جس کا اجرا 18 اکتوبر 2025 کو کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا، نئی دہلی میں ہوا۔ اس انگریزی کتاب کا نام ہے:

"Dr. Mohammad Manzoor Alam: Empowring the Marginalised"

یہ دونوں کتابیں

Genuine PublicationsMedia Pvt. Ltd. N. Delhi

کے زیراہتمام شائع کی گئی ہیں۔ توقع ہے کہ اردو اور انگریزی داں دونوں طبقوں کے لیے ڈاکٹر محمد منظور عالم کی خدمات کو سمجھنے کے لیے یہ کتابیں کافی ہیں۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ

دونوں کتابیں ڈاکٹر صاحب کی حیات میں شائع ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کے حسنات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

جیلانی بانو

ممتاز افسانہ نگار و صاحب طرز ادیبہ پدم شری جیلانی بانو اتوار یکم مارچ 2026 کی شام اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ جیلانی بانو کافی عرصے سے علیل تھیں اور حیدرآباد (دکن) میں انہوں نے آخری سانس لی۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک توانا، حساس و باشعور ادیبہ سے محروم ہوگئی۔ انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے، حقیقت پسندانہ اسلوب و سماجی شعور سے بھرپور تحریروں کے ذریعے اردو افسانے کو نئی فکری جہت سے روشناس کرایا۔

جیلانی بانو کی ولادت اترپردیش کی مردم خیز سرزمین بدایوں میں 14 جولائی، 1936 کو ہوئی۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں ہی میں حاصل کی، بعد ازاں والد محترم حیرت بدایونی (معروف شاعر) کے حیدرآباد منتقل ہونے پر اپنی بقیہ تعلیم یہیں مکمل کی۔ 1957 میں بی اے اور 1959 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی شادی عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر، ڈرامہ نگار اور شاعر ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔

جیلانی بانو نے جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ جاگیردارانہ ماحول و معاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی روایتوں اور قدروں، سیاسی و سماجی تغیرات اور تحریک آزادی کا دور تھا۔ اس دور کے حالات و مسائل نے ان کے حساس ذہن کو متاثر کیا۔ جب انہوں نے قلم اٹھایا تو اپنی تمام تر فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی سعی کی۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور دیگر سیاسی، سماجی مسائل کو کہانیوں کے پیرائے میں ڈھال دیا۔

ابتدائی عمر ہی سے انہوں نے میر تقی میر، غالب، اقبال، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، گورکی، چیخوف، موپساں، بیدی، فیض احمد فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر اور احمد ندیم قاسمی سمیت تمام بڑے بڑے ادبا کی تحریریں پڑھ ڈالی تھیں۔ ان عظیم مصنّفین کی تخلیقات کے مطالعے نے ان کی صلاحیتوں کو جِلا بخشی۔

تقریباً 22 کتابوں کی مصنفہ جیلانی بانو نے نثر کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اپنا تخلیقی سفر ملک کی آزادی کے بعد شروع کیا۔ ان کی شہرہ آفاق تحریر بعنوان 'موم کی مریم' ماہنامہ 'سویرا' میں شائع ہوئی، جس نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ ان کی پہلی کہانی 'ایک نظر ادھر بھی' 1952 میں شائع ہوئی تھی۔

جیلانی بانو نے 2002 میں ایک افسانہ لکھا تھا، جس کا عنوان ہے 'عباس نے کہا' جسے صلاح الدین پرویز نے اپنے ادبی جریدے 'استعارہ' میں شائع کیا۔ یہ افسانہ عراق پر ہونے والی جنگ میں امریکہ کی بربریت کی کہانی پر مبنی ہے۔ ان کے افسانے ان معنوں میں انفرادی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس میں ماضی، حال اور مستقبل کے اشارے بھی واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اُردو کے نسائی ادب میں وہ فکشن کے حوالے سے بلند مقام پر نظر آتی ہیں۔

جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں کچھ ایسے مسائل کو موضوع بنایا ہے، جو برسہا برس گزرنے کے بعد بھی اس جدید ترین معاشرے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور انسان اس کا مسلسل شکار ہو رہا ہے۔

'پتھروں کی بارش' کے نام سے ہندی میں 1987 میں دہلی سے ان کی کتاب شائع ہوئی۔ جیلانی بانو کے ناولٹ کا مجموعہ 'جگنو اور ستارے' کے نام سے لاہور سے 1965 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں تین ناولٹ شامل ہیں۔ 'دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر'، 'جگنو اور ستارے' اور 'رات'۔ جگنو اور ستارے کا ایک اور ایڈیشن پاکٹ بک سائز میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں صرف دو ناولٹ ہی یکجا ہیں۔ 'رات' اور 'جگنو اور ستارے'۔ جیلانی بانو کے دوسرے ناولٹ کا مجموعہ 'نغمے کا سفر' ہے۔ یہ 1977 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔

انہیں متعدد ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا جن میں غالب ایوارڈ (دہلی، 1978)، دوشیزہ ایوارڈ (پاکستان)، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ (ماسکو، 1985)، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1996)، مہاراشٹر اردو اکیڈمی ایوارڈ، نقوش ایوارڈ (پاکستان) اور ملک

کا موقر اعزاز 'پدم شری ایوارڈ' (2001) بھی شامل ہے۔

ان کی معروف تحریروں میں 'روشنی کے مینار' (افسانے)، جگنو اور ستارے، نغمے کا سفر، ایوانِ غزل (ناول)، بارش سنگ (ناول)، رستہ بند ہے، پرایا گھر (افسانوی مجموعے)، بات پھول کی، یقین کے آگے گمان کے پیچھے، 'سچ کے سوا' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں، انہوں نے حیدرآباد شہر پر بننے والی ڈاکیومنٹری 'حیدرآباد ایک شہر ایک تہذیب' کا اسکرپٹ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ حقوق نسواں کے لیے بھی ہمیشہ سرگرم رہیں۔

اُن کی کہانی ''نرسیا کی باوڑی'' پر نامور ہدایت کار شیام بینگل نے 2009 میں فلم Well Done Abba بنائی، جسے بے حد سراہا گیا۔

جیلانی بانو کا ایک اہم انٹرویو گلبرگہ کے معروف ادیب و محقق ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی نے 2012 میں لیا تھا۔ اس انٹرویو کا مکمل متن ماہنامہ اردو دنیا کے شمارہ مئی 2012 میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ جیلانی بانو کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے 2008 میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا تھا۔ ◆◆

شیخ ذوالفقار احمد نقشبندی (روحانی و دینی پیشوا)

برعظیم کے معروف و مشہور روحانی و دینی پیشوا شیخ حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی اتوار 14 دسمبر 2025 کو پاکستان کے اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 72 برس تھی۔ وہ ایک عرصے سے گردے کے عارضے میں مبتلا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں اور مریدوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

شیخ ذوالفقار احمد نقشبندی یکم اپریل 1953 کو پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر جھنگ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم اسکول اور کالجز میں ہوئی۔ 1972 میں انہوں نے بی ایس سی الکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی شعبہ میں وہ پہلے الکٹریکل اپرنٹس ہوئے، پھر چیف الکٹریکل انجینئر بن گئے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کو جمناسٹک، فٹ بال اور سوئمنگ سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ سوئمنگ کے کیپٹن اور چمپئن بھی رہے۔ جب وہ لاہور یونیورسٹی میں زیرتعلیم تھے تو ان کا تعلق (مولانا) سیّد زوّار حسین شاہ سے ہوا جو نقشبندیہ سلسلے کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے۔ انہی کی صحبت میں انہوں نے دینیات اور فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ قرآن مجید حفظ کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حضرت شاہ زوار حسین شاہ نے ذوالفقار احمد کو مکتوبات مجدد الف ثانی سبقاً سبقاً پڑھایا۔ ان کی وفات کے بعد وہ 1980 میں خواجہ غلام حبیب نقشبندی مجددیؒ سے وابستہ ہوئے۔ 1983 میں خواجہ غلام حبیب مجددی نے شیخ ذوالفقار احمد کو 'خلافت' سے سرفراز کیا۔ دریں اثنا شیخ ذوالفقار کو جامعہ قاسم العلوم ملتان سے دورہ حدیث کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی گئی۔ اپنے مرشد کی وفات کے بعد وہ دین کی اشاعت میں کلی طور پر یکسو ہو گئے۔ وہ کئی سال امریکہ میں رہے۔ اس کے بعد وہ جھنگ میں مقیم رہے۔ ان کی سرپرستی میں متعدد دینی ادارے چل رہے تھے۔ شیخ ذوالفقار احمد نقشبندی نے اصلاحی اور تبلیغی کام کے لیے پچاس سے زائد ممالک کے اسفار کیے۔ وہ دینی و عصری علوم میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے۔ انگلش زبان پر عبور تھا۔ دینی علوم کو عصری اسلوب میں پیش کرنے پر ان کو قدرت حاصل کی۔ حج کے ایام میں ہر سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ وہاں ان کے مریدین اور خلفا کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ وہ رمضان المبارک میں اعتکاف بھی کیا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ ذوالفقار احمد نقشبندی کو علماء دیوبند سے بڑی عقیدت تھی۔ کئی بار ان کو دارالعلوم دیوبند جانے کا موقع ملا۔ حیدرآباد میں بھی ان کے مریدین کی معتدبہ تعداد موجود ہے۔ ان کی تقاریر اور خطبات پر مشتمل ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اللہ رب العزت شیخ کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے، آمین! ◆◆

(جناب ندیم الواجدی کے مضمون سے جزوی طور پر ماخوذ)

طاہر فراز (شاعر)

اردو زبان و ادب کے معروف شاعر طاہر فراز کا سنیچر 24 جنوری 2026 کو انتقال ہو گیا۔ جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر عام ہوئی ادبی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ طاہر فراز گھریلو

تقریب میں شرکت کے لیے ممبئی گئے ہوئے تھے جہاں سنیچر کی صبح دل کا دورہ پڑا اور داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ طاہر فراز دبستان رامپور کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کی پیدائش 29 جون 1953 کو بدایوں (اتر پردیش) میں ہوئی تھی۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ بدایوں ہی سے کیا۔ اس کے بعد روہیل کھنڈ یونیورسٹی (بریلی) سے ماسٹر کی ڈگری لی۔ وہ کم عمری ہی سے شعر و ادب میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ان کا ننھیال رامپور تھا تو ان کا خاندان بدایوں سے رامپور منتقل ہوگیا۔ وہ اپنے زمانے کے استاد شوق اثری کے دامن تلمذ سے وابستہ ہو گئے۔

طاہر فراز بظاہر مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے لیکن ان کا شعری آہنگ آج کے مشاعروں سے بہت بلند تھا۔ ان کے شعری مجموعے 'کشکول' کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ مجموعہ صلاح الدین پرویز کے اشاعتی ادارے استعارہ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام 2004 میں منظر عام پر آیا تھا۔ طاہر فراز مشاعروں میں بڑے پُرسوز ترنم سے اپنا کلام سناتے تھے اور جب وہ گویا ہوتے تو سناٹا چھا جاتا تھا۔ ان کی غزلیں تہذیب کا آئینہ ہوتی تھیں جس میں درد بھی تھا اور سچائی بھی۔ ان کی آواز میں ایک کشش اور کاٹ تھی۔

صہیب احمد فاروقی نے طاہر فراز کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ... سورج بجھانے کا ہنر رکھنے والا شاعر اب ہمارے درمیان نہیں، مگر اس کی روشنی نظموں، اشعار اور یادوں میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

اپنی آنکھوں میں جو وہ برق و شرر رکھتے ہیں
ہم بھی سورج کو بجھانے کا ہنر رکھتے ہیں

دوسرے دن اتوار کو بعد نماز ظہر سانتا کروز (ممبئی) کے قبرستان میں طاہر فراز کے جسد خاکی کو سپرد لحد کیا گیا۔ ان کے پس ماندگان میں بیوہ کے ساتھ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔

معروف سینئر صحافی ندیم صدیقی (ممبئی) اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

''طاہر فراز کی عمر 73 برس ضرور تھی مگر وہ اپنے ظاہری حسنِ جسامت کے سبب صحت مند محسوس ہوتے تھے اور پنویل سے قریب ایک قصبے 'چوک' میں ان کے قریبی دوست اور معروف شاعر رعنا سحری کے فارم ہاؤس پر دو دن گزارے تھے۔ اُس وقت بھی وہ شگفتہ اور ہشاش بشاش لگ رہے تھے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی جو انہوں نے اس سفر میں ہمیں بتائی کہ وہ صحتِ قلب کے تعلق سے بعض مسائل میں مبتلا ہیں۔ اس کے بعد وہ ممبئی سے (غالباً) دبئی کے مشاعرے کے لیے پرواز کر گئے۔''

رئیس انصاری (دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر)

عالمی شہرت یافتہ اور دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر رئیس انصاری کا طویل علالت کے بعد بدھ 28 جنوری 2026 کی صبح انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 74 برس تھی۔ پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے شامل ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر (مولانا) خالد رشید فرنگی محلی کی اقتدا میں ادا کی گئی۔ تدفین لکھنؤ کے عیش باغ قبرستان میں ہوئی۔

رئیس انصاری کا اصل نام عبدالقوی تھا اور قلمی نام رئیس انصاری۔ وہ 20 مارچ 1951 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام عبدالمقتدر اور والدہ کنیز فاطمہ تھیں۔ ابتدائی تعلیم 'دارالمبلغین' لکھنؤ میں حاصل کی۔ 1975 سے انہوں نے شاعری کا آغاز والی آسی کی شاگردی میں کیا اور جلد ہی مشاعروں کا ایک نمایاں نام بن گئے۔ ان کی اہلیہ کا نام عابدہ رفعت انصاری ہے، جو خود ایک زمانے میں مشاعروں کی مقبول شاعرہ تھیں۔ رئیس انصاری کی زندگی لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی روایات کا حسین سنگم تھی۔ وہ لکھنؤ کے بزرگ ادیبوں، شاعروں اور سیاسی شخصیات کے ساتھ وقت گزارتے، ان کی صحبتیں اٹھاتے اور جو کچھ سیکھتے، اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے اور پھر اپنی گفتگو میں ڈھال کر اسے پیش کرتے۔ یہ ہنر کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کو اللہ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک زمانے میں اپنے اخبار 'محاذ جنگ' میں اداریے املا کرواتے تھے۔ جن میں 'ہمارا لکھنؤ' نامی سیریز بھی شامل تھی۔ یہ سیریز بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئی، جسے وہ لکھنؤ کی تاریخ کہتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے اس کتاب میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تاریخی حوالوں کے ساتھ اپنی تمام تر دیانت داری کا عملی ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، جو میری شناخت بھی ہے۔''

ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ 'تجربوں کی دھوپ' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1982 میں تنویر پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسری شعری مجموعہ 'سچائیاں' 1994 میں، تیسرا شعری مجموعہ 'ورثہ' 1999 اور چوتھا و آخری شعری مجموعہ 'تہذیب' 2010 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندی میں ان کا شعری مجموعہ 'چوپال' کے نام سے شائع ہوا۔ 'ہمارا لکھنؤ' کے عنوان سے ان کی ایک نثری کتاب 2015 میں شائع ہوئی۔

رئیس انصاری کی شاعری اردو غزل کی روایتی بنیادوں پر کھڑی ہے، مگر اس میں جدت اور تازگی کا امتزاج ہے۔ ان کی شاعری نے لکھنؤ کی گلیوں سے نکل کر ملک و بیرون کا طویل سفر طے کیا۔ ہندو پاکستان کے بےشمار مشاعروں میں انہوں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ دبئی، قطر، بحرین، سعودی عرب اور امریکہ کے مشاعروں میں بھی انہوں نے لکھنؤ کی نمائندگی کی۔ ان کی شاعری مہذب احتجاج کی آواز تھی، جو اَب خاموش ہوگئی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین! ◆◆

(محمد اویس سنبھلی کے مضمون سے ماخوذ، انقلاب 29 جنوری 2026)

کرشن کمار طور (شاعر)

پنج آبہ جیسی زرخیز دھرتی کے سپوت اُردو کے مشہور سینئر شاعر اور 'سرسبز' جیسے منفرد رسالے کے مدیر کرشن کمار طوؔر بدھ 11 فروری 2026 کو چنڈی گڑھ میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 91 سال تھی۔

کرشن کمار طوؔر 11 اکتوبر 1933 کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے سوانحی کوائف میں ایک جگہ لکھا ہے:

''... تقسیم ملک کے وقت مَیں (لاہور کے) 'سناتن دھرم ہائی اسکول' میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، لاہور سے ہجرت کے وقت ہم اور دوسرے افراد ملٹری ٹرکوں میں لد کر اپنی پہلی منزل امرتسر پہنچے تھے۔''

امرتسر ہی مَیں طوؔر نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر پٹیالہ سے گریجویشن اور ماسٹر کیا۔ مشہورِ زمانہ پُر فضا مقام 'کلّو' اور 'منالی' میں بطور ٹورسٹ افسر، اُن کی تعیناتی ہوئی اور اس کے بعد وہ شملہ اور دھرم شالہ (ہماچل پردیش) میں تبادلے کے بعد قیام پذیر ہوئے۔ 'دھرم شالہ' ہی میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر وظیفہ یاب ہوئے۔ دھرم شالہ ہی میں انہوں نے اپنا گھر بنایا اور ایک ہوٹل بھی تعمیر کیا، جو بعد میں بینک لون کی ادائیگی کے سبب گھاٹے میں بیچنا پڑا۔ ہر چند کہ ان کی ایک بیٹی چنڈی گڑھ اور بیوہ اپنے بیٹے کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں، مگر طوؔر نے اپنے بچوں کے پاس رہنے کے بجائے دھرم شالہ ہی میں مستقل رہائش اختیار کی۔ ان دنوں وہ اپنی بیٹی کے پاس علاج و معالجے کے سلسلے میں مقیم تھے جہاں انہوں نے آخری سانس لی اور اسی شام چنڈی گڑھ میں ان کی چِتا کو اگنی بھی دی گئی۔

جب انبالہ میں وہ مقیم تھے تو انہوں نے شعر گوئی شروع کی، اور یہیں انہوں نے داغ اسکول کے ممتاز اساتذہ کی آنکھیں دیکھیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا ظفر علی خاں کا شعری قول ہے:

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے''

میلا رام وفا اکثر و بیشتر مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے انبالہ آتے رہتے تھے اور وہیں طوؔر کو ان سے ادبی گفتگو کے مواقع ملے یا یوں کہیے کہ انہوں نے اس طرح میلا رام وفا سے استفادہ کیا۔

کرشن کمار طوؔر کی شعریات جب جب ہم پڑھتے ہیں تو ان کے ہاں اساتذۂ قدما کی طرح زبان کی رنگارنگی ملتی ہے۔

دورِ حاضر کے شعرا میں فارسی جیسی شیریں زبان سے اجتناب کی وجہ اکثر یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ 'فارسی کے استعمال سے شعر ثقیل ہوجاتا ہے' جبکہ طوؔر کا یہ یقین تھا کہ فارسی کا استعمال شعر کے حُسن کو دوبالا کردیتا ہے۔

طوؔر کا خیال تھا کہ جواہر پر چاہے جتنی گرد پڑ جائے لیکن دیر سویر ان کا چمکنا لازمی امر ہے۔

طور کا یہ اعتراف بھی قابلِ ذکر ہے:

روایت میری نَس نَس میں رواں دواں ہے، چونکہ آدمی اپنے ماضی قریب اور حال سے غافل نہیں ہوسکتا، اس لیے میری شاعری میں دونوں (روایت و جدّت) کا اتصال عود کر آیا ہے، روایتی شاعری میں نئی سوچ کا تڑکا اس کی ترسیل اور لطف کو دو

آتشہ کر دیتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے۔

طوؔر کا یہ بھی تصور ہے:

''نئے اور پرانے چراغ کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے، شاعری شروع ہی سے کربِ ذات کا موضوع رہی ہے، فرق صرف فنکارانہ اظہار کا ہے اور یہ فرق رہے گا۔''

کرشن کمار ہوتے ہوئے طوؔر اپنے ادبی عقیدے میں کسی مصلحت کا شکار نہیں رہے، اُن کا یہ بیان اس کی شہادت دے رہا ہے:

''عملی طور پر ہر شخص پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اُردو زبان و ادب کے لیے ماحول بنانے کے بہتر مواقع تلاش کرے لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان مادّی آسائش کو تج کر کے ایک بہتر خواب کو سامنے رکھے اور اپنے احساسات و جذبات سے اس زبان میں خوشی حاصل کرے۔''

طوؔر جیسے شخص نے پوری عمر اُردو زبان و ادب میں صَرف کی اور اپنے ایک شعر میں وہ کہہ گئے ہیں:

یہ اختیار کی صورت، بہت عجیب ہے طوؔر
پرانا ڈالتا ہوں اور نیا نکالتا ہوں

طوؔر کی شعری کتابوں کے نام یوں ہیں:

شعرِ شگفت، عالمِ عین، مشک منور، رفتہ رمز، سرنامۂ گماں نظری، غرفۂ غیب، چشمۂ چشم، گلِ گفتار، خاکِ خمیر، دیدِ مدید، بہار بخت، وصلِ وجود، کشش کاف کلام (کلیات)

آج ہمارے عام شعرا اپنی روایات اور اس کی لغوی رنگارنگی سے چونکہ ناواقف ہیں لہٰذا 'آسان زبان' کا ڈھول پیٹ پیٹ کر وہ اپنی ضدِ علمی کا اعتراف کرتے ہیں اس کے برعکس کرشن کمار طوؔر جیسے شخص کی کتابوں کے صرف ناموں پر غور کیا جائے تو قاری اُن کی لفظیات ولُغَت کا اندازہ کر سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ طوؔر جیسے شاعر کتنے جدید اور کس قدر روایتی محاسن کے دلدادہ رہے ہیں اور کیوں؟ کیوں اس لیے کہ وہ اپنی روایات اور اس کی لفظیات کا علم ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے محاسن معانی کا انہیں عرفان بھی حاصل تھا جس سے انہوں نے بہ لحاظِ توفیق استفادہ بھی کیا۔

طوؔر کی شعری کتابوں پر بہار اُردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی کے ایوارڈز، انجمن ترقئ اُردو (جمشید پور شاخ) کا قومی امیر خسرو ایوارڈ بھی تفویض کیا گیا اور 2012 میں شعری کتاب 'غرفۂ غیب' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی انہوں نے حاصل کیا۔

کرشن کمار طوؔر کی ادبی زندگی دورِ حاضر میں ہم جیسے ریا اور طمع رکھنے والوں کے لیے ایک سبق سے کم نہیں، وہ اپنی زبان اور اپنی شعریات میں نہایت اخلاص کے حامل شخص تھے۔ آنجہانی طوؔر نے ایک طویل مدت تک 'سرسبز' جیسا یک موضوعی رسالہ بھی نکالا جس میں وہ شاعری اور بالخصوص غزلیات پر نہایت وقیع مضامین اور ایک دُنیا کے شعرا کی تخلیقات کو بغیر کسی اجرت و معاوضہ، شاعری کے دلدادگان تک پہنچاتے رہے۔

طوؔر کی رِحلت سے زیادہ ہمیں اس کا غم ہے کہ اب ایسے مخلصین شعر و ادب ہمارے ہاں تلاش کرنا پڑیں گے اور ضروری نہیں کہ اس تلاش کا کوئی مثبت نتیجہ بھی ہمارے ہاتھ لگے! ♦♦

(تحریر: سینئر صحافی ندیم صدیقی، ممبئی)

اسد رضا (صحافی، شاعر، مزاح نگار)

اردو کے سینئر صحافی، شاعر اور مزاح نگار اسد رضا (سیّد اسد رضا نقوی) کا اتوار یکم فروری 2026 کو دہلی کے ایک ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 74 برس تھی۔ ریختہ کے مطابق اسد رضا کی ایک بیٹی ثنا اسد ہیں۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سابق ایڈیٹر اسد رضا کی تدفین آبائی وطن بجنور میں ہوئی۔

اسد رضا 2 جنوری 1952 کو مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا آبائی وطن بجنور (اتر پردیش) تھا۔ اسد رضا ایک باخبر اور باضمیر انسان تھے۔ انہوں نے صحافت کے ساتھ شاعری بھی کی، مترجم اور مزاح نگار بھی تھے۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے:

''اسد رضا گھسے پٹے موضوعات کی بجائے نئے اور متنوع موضوعات پر شگفتہ اور دلچسپ اظہار خیال کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔''

صحافت میں ان کا سفر دہلی سے شروع ہوا، جہاں انہوں نے 'سوویت جائزہ' سے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ چند ماہ ہفت روزہ 'نئی دنیا' سے بھی وابستہ رہے۔ بعد ازاں جب 'راشٹریہ سہارا' کا اجرا ہوا تو وہ اس کا حصہ بن گئے اور کچھ عرصہ اس کے

ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ اخبار کے مستقل کالم نگار تھے۔ راشٹریہ سہارا میں انہوں نے حالاتِ حاضرہ پر 'قطعات' بھی کہے اور طنزیہ کالم 'تلخیاں' کے عنوان سے لکھا، جو بہت مقبول ہوا۔ ان کے کالم محض خبر نہیں بلکہ فکر انگیز ہوا کرتے تھے۔ وہ حالاتِ حاضرہ پر لکھتے تو قاری کو صرف مطلع نہیں کرتے تھے بلکہ سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے، اور جب طنز و مزاح لکھتے تو ہر قہقہے کے پیچھے کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا سوال ضرور چھوڑ دیتے تھے۔

بچّوں کے ادب میں بھی اسد رضا کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ بچوں کی زبان میں بات کرنا اور پھر بھی ادب کا معیار بلند رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسد رضا نے یہ کر دکھایا۔ شاید اسی لیے ان کی تحریریں نصاب کا حصہ بھی بنیں اور اعزازات سے بھی نوازی گئیں۔

اسد رضا کی شاعری روایتی شاعری نہیں تھی۔ ان کے اشعار میں سیاست سانس لیتی تھی اور معاشرہ کا اصل چہرہ سامنے آجاتا تھا۔ منافقت، حرص اور نفرت ان کے موضوعات تھے، مگر بیان میں کہیں بھی وعظ یا خطابت نہیں تھی۔ یہ شعر دیکھیے:

چمچہ گیری کسی افسر کی منسٹر کی اسد
آج کل عین سعادت ہے خدا خیر کرے

یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

دباؤ تھا کہ لالچ تھا لگا اخبار یہ پڑھ کر
حقیقت اور ہی کچھ تھی خبر کچھ اور کہتی ہے
نشانی چھوڑ جاتی ہیں اسدؔ یہ عمر کی راہیں
مسافر کچھ کہے گرد سفر کچھ اور کہتی ہے

اسد رضا کے انتقال سے اردو صحافت اور طنز و مزاح کا ایک روشن چراغ بجھ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ گئے نہیں ہیں، بس صفحہ بدل کر اگلے باب میں داخل ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد اویس سنبھلی کے تعزیتی مضمون سے ماخوذ، انقلاب 2 فروری 2026)

راج کماری اندرا دیوی (شاعرہ، ادیبہ، مصورہ)

معروف بزرگ شاعرہ، ادیبہ اور مصورہ راج کماری اندرا دیوی دھن راج گیر حیدرآباد میں واقع گیان باغ پیلیس میں منگل 13 جنوری 2026 کو انتقال کر گئیں۔ ان کی عمر تقریباً 96 برس تھی۔ وہ معروف تیلگو شاعر گنٹور شیشند رشرما کی اہلیہ تھیں۔ ان کی شادی 1971 میں گنٹور شیشند رشرما سے ہوئی تھی جن کے تین بچّے تھے۔

راج کماری اندرا دیوی کی پیدائش 17 اگست 1930 کو حیدرآباد (دکن) میں ہوئی تھی۔ وہ راجہ دھنراج گیرجی بہادر کی دختر تھیں۔ راجہ دھنراج گیرجی بہادر، نظام آف حیدرآباد عثمان علی پاشاہ کے مصاحب تھے۔ ان کے والد سابق وزیر اعظم حیدرآباد راجہ کشن پرشاد کے رفیقِ خاص تھے۔ اندرا دیوی کو حیدرآباد کی مشہور شخصیات سالار جنگ سوم میر یوسف علی خاں اور مخدوم محی الدین کی رفاقت حاصل رہی۔ ابتدائی تعلیم محبوب گرلز اسکول میں ہوئی۔ بعد ازاں ان کی زیادہ تر تعلیم ایک انگریز گورنیس کے ذریعہ گھر پر ہوئی۔ ان کے ادبی مزاج پر علامہ اقبال، مرزا غالب اور سری اربندو کی تخلیقات کا گہرا اثر رہا۔ وہ انگریزی میں شاعری کرتی تھیں لیکن اردو زبان و ادب سے اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں:
Return Eternity (1965), Parting in Mimosa (1968), Memories of the Deccan (2008)
قابل ذکر ہیں۔

اندرا دیوی نے 1968 میں متحدہ آندھرا پردیش ہندی اکیڈمی کی پہلی صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں ماریشس کے سفر کے دوران میں ان کی دوستی ماریشس کے معروف مصنف اور پینٹر Malcolm de Chazal سے ہوئی۔ اندرا دیوی اپنے ساتھ وہاں سے ایک درجن سے زائد پینٹنگ کے کمیاب نمونے اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ وہ خود بھی ایک پینٹر اور اچھی فنکار تھیں۔ ان کی پینٹنگ کے نمونے کی نمائش 1970 میں معروف مصور ایم ایف حسین کی سرپرستی میں ممبئی میں منعقد ہوئی۔ ان کو فوٹو گرافی میں بھی خاص دلچسپی تھی۔

اندرا دیوی کے دیرینہ تعلقات نظام خاندان سے رہے۔ ان کے قریبی دوستوں میں جاوید اقبال، جواہر لعل نہرو، سروپلی رادھا کرشنن اور وشوونتا ستیہ نارائنا شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1973 میں ادب میں نوبیل پرائز کے لیے اندرا دیوی کا نام پیش

کیا گیا تھا۔

دوحہ قطر کے مظفر نایاب نے اندرا دیوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے:

برائے راجکماری اِندرا دیوی دھنراج گیر
با ادب اَرفع سخنور اِندرا دھنراج گیر
2026 عیسوی

♦♦

پروفیسر احمد رضا صدیقی (ماہر تعلیم، دانشور)

بتاخیر اطلاع کے مطابق باڑھ (صوبہ بہار) کے معروف تعلیمی ادارہ انوگرہ نارائن کالج کے سبکدوش صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر احمد رضا صدیقی کا سوموار 22 دسمبر 2025 کو پٹنہ کے محلہ کھجور بنا میں واقع امبرا اپارٹمنٹ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 سال تھی۔ پس ماندگان میں اہلیہ محترمہ آبرو بانو، تین بیٹے ڈاکٹر فیض اکرم صدیقی، شعیب احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد نیاز عالم اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔

پروفیسر احمد رضا صدیقی بہار شریف کے قریب ایک گاؤں رمضان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ بھاگلپور یونیورسٹی سے انہوں نے بی اے میں ٹاپ کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے 1973 میں ایم اے کیا۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم اے کیا۔ بہار یونیورسٹی سے فارسی زبان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1973 سے 1981 تک انہوں نے LIC میں ملازمت کی۔ اس کے بعد ان کا تقرر بحیثیت پروفیسر اے پی ایس ایم کالج، برونی میں ہوا۔ 1987 میں ان کا تبادلہ اے این ایس کالج باڑھ میں ہوا، جہاں سے 2016 میں وہ سبکدوش ہوئے۔ ان کو اردو کے ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی انگریزی کے ساتھ اردو اور فارسی کی تعلیم دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری تہذیب اردو فارسی میں ہے، اس لیے ان زبانوں میں عبور ہونا لازمی ہے۔

پروفیسر احمد رضا صدیقی ہمیشہ لوگوں کی مدد کرنے اور رہنمائی کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے، دکھاوا اور فضول خرچی سے دور رہتے تھے۔ انہیں علامہ اقبال کا یہ شعر بہت پسند تھا:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

(مرسلہ محمد ممتاز فرخ نجمی، پٹنہ۔ موبائل: 9798909392)

♦♦

احمد رشید شروانی (ماہر تعلیم اور دانشور)

معروف ماہر تعلیم اور بھارت سیوا ٹرسٹ کے روح رواں اور منیجنگ ٹرسٹی احمد رشید شروانی کا سوموار 23 فروری 2026 کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 94 سال تھی۔ یہ اطلاع بھارت سیوا ٹرسٹ کے سکریٹری انوار اللہ نے دی۔ 15 سال قبل مرحوم ڈی ایل ایف قطب انکلیو، گروگرام سے حیدرآباد شفٹ کر گئے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ نصرت شروانی، ایک بیٹا تصدق شروانی، بیٹیاں آمنہ اور آسیہ شروانی شامل ہیں۔ شروانی صاحب جوانی کے دنوں سے ہی مسلم بچوں کی تعلیم کے حوالہ سے آخر دم تک اسی کام میں لگے رہے۔ اس کے لیے اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال وغیرہ سے مسلم اسکولوں اور کالجوں سے دسویں اور بارہویں کلاسوں کے رزلٹ منگواتے، ان کا سال بہ سال تجزیہ کرتے اور پرنسپلوں کو خط کے ذریعہ بتاتے کہ رزلٹ میں کہاں کہاں بہتری ہوئی اور کہاں اس کی گنجائش ہے۔ ٹرسٹ کی جانب سے ہونہار طلبا و طالبات کو انعام اور محنتی ٹیچرز کو ایوارڈ بھی بھیجے جاتے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران شروانی صاحب مشاورت (سیّد شہاب الدین) کے ٹریژرار بھی رہے تھے۔

احمد رشید شروانی 1932 میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان مجاہدین آزادی کا تھا۔ ان کے چچا تصدق احمد خاں شروانی اور نثار احمد خاں شروانی آزادی سے قبل کانگریس کے اہم قائدین میں شمار ہوتے تھے۔ وہ تصدق احمد خاں شروانی کے چھوٹے بھائی فدا احمد خاں شروانی کے فرزند تھے۔

احمد رشید شروانی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے ہفتہ وار اخبار 'دوست' بھی شائع کیا تھا۔ تعلیم

حاصل کرنے کے بعد وہ دہلی آ گئے اور 'بھارت سیوا ٹرسٹ' قائم کر کے مسلم اسکولوں کی حالت سدھارنے کا کام کیا۔ اردو اخبارات میں سماجی اور تعلیمی مسائل پر ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں 'قومی آواز' میں مراسلات کا کالم شروانی صاحب کے مراسلوں سے ہی آباد تھا۔

احمد رشید شروانی مشہور زمانہ جیپ انڈسٹریز کے شراکت داروں میں تھے۔ وہ جیپ انڈسٹریز کی آمدن سے حاصل ہونے والی بیشتر رقم کو مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی دور کرنے میں صرف کرتے تھے۔ وہ ذاتی طور پر ایک دلچسپ انسان تھے، ان میں بذلہ سنجی بہت تھی۔ ان کے مراسلات کا انداز بھی طنزیہ اور مزاحیہ ہوا کرتا تھا۔

احمد رشید شروانی نے جذباتی اور اشتعال پھیلانے والی قیادت کو کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ کانگریس کے سیکولرزم کے بھی شاکی تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کے لیے کانگریس کی فرقہ پرست قیادت کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اتر پردیش میں اردو کا مسئلہ بگاڑنے کا اصل کام وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت نے کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اتر پردیش کابینہ سے ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی کو ہٹا کر دہلی بھیجنے کا کام بھی پنت ہی نے کیا تھا اور اسی کے بعد بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں۔ احمد رشید شروانی بنیادی طور پر ایک آزاد خیال انسان تھے۔ وہ کمیونزم سے متاثر تھے اور ان کے پرانے دوست ان کو کامریڈ شروانی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تعلق سے بھی ان کی سوچ ترقی پسندانہ تھی۔ وہ رجعت پسندی کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اپنی طرز کی زندگی گزاری اور آخر تک ان کے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی۔ ◆◆ (معصوم مرادآبادی کے مضمون، انقلاب 25 فروری 2026 سے ماخوذ)

جتیندر بِلّو (معروف فکشن نگار)

اردو کے مشہور فکشن نگار جتیندر بِلّو اتوار 8 فروری 2026 کو لندن میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 89 برس تھی۔

اردو کے استاد الیاس شوقی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ جتیندر دیو لامبا المعروف جتیندر بِلّو 18 نومبر 1937 کو پشاور (خیبر پختون خوا) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ 1975 تک ممبئی میں رہے۔ 1976 میں جتیندر بلّو انگلینڈ ہجرت کر گئے جہاں انہوں نے آخری سانسیں لیں۔

سینئر شاعر اور مترجم یعقوب راہی نے جتیندر بلّو کی قلمی نگارشات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے چند نام اس طرح ہیں: پرائی دھرتی (افسانوی مجموعہ)، اپنے لوگ (1997)، جزیرہ (1999)، وشواس گھات، پہچان کی نوک پر، انجانا کھیل (2001)، نئے دیس میں (1998)، چکّر (2007)، درد کی حد سے پرے (2010) اور آخری پڑاؤ (افسانوں کا مجموعہ)۔ اُن کا سوانحی کولاژ دو حصوں میں 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی' 2023 میں قلم پبلی کیشنز نے شائع کیا تھا۔ 'مَیں اور میری شخصیت' نامی کتاب ستمبر 2023 میں ممبئی کے کتاب دار نے شائع کی ہے۔ ممبئی کے 'نیا ورق' جیسے ممتاز رسالے میں ان کی تخلیقات تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ لاولد تھے ان کے پس ماندگان میں صرف بیوہ ہیں۔ ◆◆ (مرسلہ ندیم صدیقی، ممبئی)

ابوالخیر نشتر (شاعر اور صحافی)

معروف بزرگ شاعر اور صحافی ابوالخیر نشتر جمعرات 12 فروری 2026 کی صبح تقریباً پانچ بجے اپنے آبائی شہر بتیا (بہار) میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 79 برس تھی۔ اسی دن بعد نماز عصر بتیا کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

نام ہے میرا ابوالخیر، تخلص نشتر
بتیا شہر مری جائے اماں ہے یارو!

ابوالخیر نشتر 23 ستمبر 1947 کو بتیا کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللطیف صاحب سگولی شوگر فیکٹری میں کین منیجر تھے۔ حالات نے آسان راستہ نہیں دیا۔ فروری 1970 میں غلام سرور کی ادارت میں نکلنے والے روزنامہ 'سنگم' پٹنہ سے وابستہ ہوئے۔ اس طرح ان کی صحافت کا سفر شروع ہوا۔ ان کے ادبی مضامین ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ ان کی شاعری کا

آغاز 1973 کے بعد ہوا۔ کچھ عرصہ انہوں نے درس گاہ اصلاحی میں تدریس بھی کی۔

ابوالخیر نشتر مارچ 1975 میں ادارہ 'ادبی سنگم' بتیا کے صدر منتخب ہوئے۔ اس دور کی تلخیوں کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''پھر کیا پوچھنا ہے، غیر تو غیر ٹھہرے، اپنوں نے بھی سرِ راہ طنز و تیر کی سنگ باری شروع کر دی، جیسے میں انسان نہیں کوئی بوڑھا درخت ہوں۔ دراصل زندگی نے یہیں سے ادبی موڑ اختیار کیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ جس قدر حسد و حقارت کی قندیلیں میرے خلاف انجمن در انجمن جلائی گئیں، وہی قندیلیں میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی گئیں۔''

'لفظ لفظ آئینہ' اور 'الفاظ کی خوشبو' کے بعد ابوالخیر نشتر کا تیسرا شعری مجموعہ 'بولتے الفاظ' 2017 میں شائع ہوا۔ نشتر نے اپنی اس کتاب میں نظموں اور غزلوں کے ذریعے معاشرے کی مختلف برائیوں، ملک میں نفرت پر مبنی سیاسی ماحول اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اپنے خیالات اجاگر کیے ہیں۔ 2021 میں ان کی ایک اور کتاب 'روشن تر الفاظ' منظر عام پر آئی۔ 17 دسمبر 2025 کو اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام ایک سمینار و مشاعرہ میں ابوالخیر نشتر کی نمایاں ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزاز دیا گیا تھا۔ لیکن صحت کی کمزوری کے سبب وہ اس تقریب میں شرکت نہ کر سکے، تو ذمہ داران خود ان کے گھر پہنچے۔

ابوالخیر نشتر نے اپنے اشعار کے ذریعے نوجوانوں کے لیے بھی محبت کے موضوع سے ہٹ کر بہت کچھ پیغام دیا ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے:

تاریخ کے صفحوں میں، ماضی کے فسانوں میں
پاؤ گے ہمیں ڈھونڈو، ان اونچی اڑانوں میں
تم میری نواؤں کا بس اتنا اثر سمجھو
یہ آگ لگا دیں گی، برفیلی چٹانوں میں
پروازِ تخیل کی محکوم سیاست ہے
اب خاک ہی پاؤ گے تسبیح کے دانوں میں

انہوں نے اپنی طویل زندگی کا سفر مکمل کیا، مگر ٹوٹ کر بکھرے نہیں۔ اپنی طویل زندگی کے تجربہ کی کوکھ سے ہی شاید یہ شعر نکلا ہوگا:

پتھروں کے شہر میں شیشے جیسا بدن
میں ہی تھا جو ٹوٹ کر بکھرا نہیں تھا

♦♦

(افروز عالم ساحل کا خراجِ عقیدت، انقلاب 13 فروری 2026 سے ماخوذ)

سیّد احمد وصی رضوی (شاعر و ادیب اور فلمی نغمہ نگار)

اُردو کے ممتاز سینئر شاعر و ادیب، براڈ کاسٹر اور فلمی نغمہ نگار احمد وصی رضوی جن کا ایک شعر (وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے ÷ ایسی بولی وہی بولے جسے اُردو آئے) ایک دُنیا میں زباں زدِ عام ہے۔ احمد وصی ایک مدت سے ذیابیطس (شوگر) جیسے موذی مرض کی گرفت میں تھے۔ پیر 12 جنوری 2026 کی شب کو آکسیجن کی سطح کم ہونے کے سبب وہ انتقال کر گئے۔ اس کی عمر تقریباً 83 سال تھی۔

سید احمد وصی رضوی اسکولی سرٹیفکیٹ کے مطابق 8 اکتوبر 1943 کو یوپی کے سیتاپور کے محلّے قضیانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد سید محمد اطہر رضوی زائر سیتاپوری ایک اچھے شاعر کے طور پر اپنے دیار سے باہر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ زائر سیتاپوری اپنے زمانے کے شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے وہ نہ صرف مرثیہ گو تھے بلکہ وہ ایک قدیم طرزِ مجلس جسے نثّاری، کہا جاتا ہے، اس میں انہیں کمال حاصل تھا۔ احمد وصی کے ایک چچا نادم سیتاپوری بھی مشہور تھے۔

احمد وصی کی ابتدائی تعلیم سیتاپور کے گورنمنٹ کالج اور راجہ کالج میں ہوئی بعدۂ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری لی اور ساتھ ہی ساتھ 'لٹریسی ہاؤس' (لکھنؤ) سے 'رائٹرس کورس' بھی کیا، انہیں ڈراموں سے بھی شغف رہا۔ سیتاپور میں ان کا خاندان ایک علمی تشخص رکھتا تھا ان کے گھر پر ایک اچھی خاصی لائبریری ہوتی تھی۔ سیتاپور کی گھر گھر کی مجلسوں نے ان کے ہاں مذہبی میلان کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن و قلب میں شعر و ادب کے رجحان کو بڑی کمک پہنچائی اور وہ ابتدائے عمری ہی میں موزوں طبع ہو گئے تھے۔ ادارۂ 'شمع' (دہلی) سے شائع

ہونے والے بچوں کے جریدے ’کھلونا‘ سے انہوں نے اپنا قلمی سفر شروع کیا۔ ان ہی دنوں انہوں نے بچوں کے لیے اپنا اوّلین ڈرامہ ’ڈارلنگ‘ لکھا، جسے مقبولیت ملی۔ اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور وہ لکھنؤ کے مشہور بچوں کے رسالے ’ٹافی‘ میں بھی لکھنے لکھانے کے ساتھ لکھنؤ کی ادبی مجلسوں اور محفلوں سے بھی اپنی ذہنی آبیاری کرتے رہے۔ اُردو کے مشہور اُستاد اور ناقد احتشام حسین کی صحبت سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

اپنے والدِ محترم کی رِحلت کے بعد احمد وصی تلاش معاش کے لیے ممبئ میں اپنے چچا محمد حیدر رضوی کے پاس آگئے۔

ممبئ میں اُس وقت کے مشہور اُردو ہفت روزہ ’بِلٹز‘ کے ایڈیٹر اختر حسن نے انھیں کتابوں پر تبصرے لکھنے کا کام دِیا۔ اسی دوران میں آل انڈیا ریڈیو پر بھی اُن کی رسائی ہوگئی۔ آل انڈیا ریڈیو پر اُس دَور میں مختار احمد اور ممتاز بصیر جیسے شفیق حضرات بھی تھے جو نئے لکھنے والوں کے لیے ایک زینہ ہوا کرتے تھے۔ مختار احمد نے مشہور و مقبول ریڈیو پروگرام ’ہَوا محل‘ کے لیے ڈرامہ ’خالی مکان‘ لکھوایا۔ اس طرح احمد وصی نے ریڈیو کے پہلے پائیدان پر قدم رکھا۔ احمد وصی آل انڈیا ریڈیو کے ’وِوِدھ بھارتی‘ کے شعبے سے (1963 میں) وابستہ ہوئے۔ جو پرانے لوگ ہیں انھیں ’وِوِدھ بھارتی‘ کے دو پروگرام (چھایا گیت اور رجنی گندھا) یاد ہوں گے، جو فلمی گانوں پر مشتمل ہوتے تھے جسے احمد وصی ہی نشر کرتے تھے، جس میں اُنہوں نے اُردو کے کلاسک لہجے و لفظیات کو خوب صورتی سے نہیں ’بڑی خوبی‘ سے برتنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس پروگرام میں احمد وصی کا لہجہ گونجتا تھا، ہر چند کہ اُس دَور کے ریڈیو افسران اور رفیقانِ کار نے اُن کی نہ صرف حوصلہ شکنی کی بلکہ مخالفت بھی کی مگر اُن کے دونوں پروگرام (چھایا گیت اور رجنی گندھا) کی عوامی مقبولیت نے اُن کے حوصلوں کو مہمیز دِی اور یہ دونوں پروگرام ایک طویل مدت تک وِوِدھ بھارتی سے نشر ہوتے رہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب وِوِدھ بھارتی پر مشہور براڈ کاسٹر اور پلے بیک سنگر کبّن مرزا کی آواز اوران کا پروگرام بھی لوگ بڑی توجہ اور چاؤ سے سنتے تھے۔

احمد وصی نے وِوِدھ بھارتی سے اہم شخصیات کے انٹرویوز بھی نشر کیے جس میں وہ چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ ہماری ناقص یادداشت کے مطابق کئی اُبھرتی ہوئی صلاحیتوں کو بھی انہوں نے وِوِدھ بھارتی کے ذریعے متعارف کروایا، جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔

ریڈیو کے پروگراموں کے سبب وہ ادبی حلقوں میں تو اپنا تشخص بنا ہی چکے تھے، اس تشخص نے فلمی دُنیا میں ان کے داخلے کو آسان کر دِیا۔ اُس دور کے مشہور موسیقار سردار مَلِک (انّو مَلِک کے والد) نے فلم میں احمد وصی کی راہ کو روشن کیا۔ مشہورِ زمانہ موسیقار او پی نیّر کے ساتھ انہوں نے (1974 کی) مشہور فلم ’پران جائے پر وچن نہ جائے‘ سے اپنا فلمی سفر شروع کیا۔ یہ فلم ممتاز اسکرپٹ رائٹر علی رضا نے ڈائریکٹ کی تھی، جس میں کلیدی کردار سنیل دت اور ریکھا نے ادا کیا تھا۔ 1979 میں شتروگھن سنہا کی مشہور فلم ’ہیرا موتی‘ میں بھی احمد وصی نے اپنے شعری افکار کے جوہر پیش کیے۔

احمد وصی کا اوّلین شعری مجموعہ ’بہتا پانی‘ لکھنؤ کے علوی پبلشر نے (1983 میں) شائع کیا، جسے مقبولیت ملی اور ملک کی کئی اُردو اکادمیز نے انھیں انعام سے بھی نوازا۔ اُن کی غزلوں کا مجموعہ (بادلوں کے شہر) ہندی رسم الخط میں ’جیون پربھات پبلشرز کے زیرِ اہتمام اور اُن کی نظموں کا مراٹھی ترجمہ بھی کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ موصوف کا دوسرا شعری مجموعہ الیاس شوقی کے مشہور قلم پبلی کیشنز (ممبئ) سے ’جگنو میرے ساتھ ساتھ‘ کے عنوان سے (2004 میں) شائع ہوا۔ بچوں کے لیے بھی احمد وصی نے اپنے شعری مجموعے (’تتلیاں‘ اور ’گُلد ان‘) شائع کیے۔ ان کے مختلف کلام کئی گلوکاروں کی آواز میں کیسٹوں اور سی ڈیز کی شکل میں بھی منظر عام پر آ کر عوام و خواص میں مقبول ہوئے۔ انہوں نے ٹی وی سیریلز کے لیے بھی لکھا۔ چلڈرن فلم سوسائٹی کی فلم (The Tiger & Paintal Priest) میں ہندی مکالمے بھی لکھے۔

انہوں نے اپنے والدِ مرحوم زائر سیتا پوری کی رثائی شاعری کی ایک کتاب ’کربلا‘ مرتب کر کے اسے شائع کیا۔ احمد وصی کی شہرت ندی نالوں کے شور شرابے جیسی نہیں بلکہ سَمُندر کے گہرے سکوت جیسی تھی۔

احمد وصی علم و ادب کے کام سے ایک باوقار زندگی گزار کے رُخصت ہوئے۔ اُن کی شاعری اور شخصیت پر مناظر عاشق ہرگانوی نے ایک کتاب بھی مرتب کی۔ احمد وصی کو اپنے وطن سیتاپور سے بڑا اُنس تھا۔ وہ ہفتے بھر پہلے ہی سیتا پور سے ممبئی لوٹے تھے، جہاں انہوں نے گزشتہ شب آخری سانس لی۔ ان کی نعش ممبئی سے وطنِ مالوف لے جائی گئی جہاں 13 جنوری کو سیتاپور کی مردم خیز سرزمین نے اپنے سپوت کے لیے سینہ کھول دیا اور اُن کے جسدِ خاکی کو سپرِ دِلحد کیا گیا۔ احمد وصی کے پسماندگان میں بیوہ اِرم سلطان اور دو بیٹے حسین زائر پیکر اور عقیل زائر نیّر شامل ہیں۔ ♦♦ (تحریر و پیشکش: ندیم صدیقی، ممبئی)

رشید عباس (بزرگ ادیب)

ممتاز بزرگ اُردو ادیب رشید عباس کا جمعہ 19 دسمبر 2025 کی شب انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 87 برس تھی۔

رشید عباس 5 جون 1938 کو (نصیر آباد۔ ضلع جلگاؤں۔ مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ موصوف ایک اچھے انشائیہ نگار اور طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھنے والے اُردو کے ایک معروف ادیب تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اُن کے ہاں عام لکھنے والوں کی طرح 'مَیں کنہیا لعل کپور ہوں' جیسا کوئی 'احساس' نہیں تھا۔ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔

وہ کوئی تین دہے قبل ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے، بھساول کے ادبا و شعرا کا جب بھی تذکرہ ہوگا اس میں رشید عباس کا نامِ نامی اپنے اخلاصِ علمی اور اخلاقِ شخصی دونوں لحاظ سے اوّل اوّل لیا جائے گا۔

بھساول میں انہوں نے کل ہند مشاعرے بھی منعقد کیے اور اُس دَور کے مشاہیر شعرا سے ان کے روابط تھے۔ انہوں نے ممبئی میں تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ اپنی عملی زندگی کی ابتدا 1956 میں ممبئی ہی سے کی تھی۔ وہ ممبئی میونسپل کارپوریشن کے شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ممبئی نمبر 3 کے ایک میونسپل اسکول میں انہوں نے بچوں کو پڑھایا، ممبئی کے مشہور شاعر ظفر گورکھ پوری کے انتقال پر انہوں نے اپنے تعزیت نامے میں لکھا تھا:

''غالباً 1956ء کا زمانہ تھا، گھوگھاری محلہ (ممبئی) اردو پرائمری میونسپل اسکول میں میرا تقرر بحیثیت مدرس ہوا تھا، میرے ایک مدرس ساتھی، علی صاحب تھے جن کا تعلق مشرقی یو پی سے تھا۔ اُنہوں نے مجھے ظفر الدین سے متعارف کرایا تھا بعد میں علی صاحب سے واسطہ ختم ہو گیا اور ظفر باقاعدگی سے میرے پاس آنے جانے لگے، اُس وقت تک وہ ظفر گورکھپوری نہیں تھے۔ اُن کی شاعری ابتدائی درجات میں تھی کبھی کبھار دو چار شعر ضرور سنا جاتے تھے جو اُن کے روشن مستقبل کا پتہ دیتے تھے۔ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں اچانک کالج اور ملازمت کو خیرباد کہہ کر وطن لوٹ آیا۔''

رشید عباس کو موسیقی سے بھی خاصا شغف تھا۔ اسی شوق نے انہیں موسیقار نوشاد علی سے قریب کیا اور اس ذوقِ ساز و آواز کے سبب نوشاد صاحب کے ساتھ اُن کا بڑا تعلق رہا۔ یہ سب کم و بیش نصف صدی کا قصہ ہے۔ بعد میں انہوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کی اور اسی ملازمت سے وہ 1998 میں سبکدوش ہوئے۔ وہ جسمانی طور پر نہایت نحیف وضعیف نظر آتے تھے مگر ذہنی اور قلبی طور پر وہ خاصے توانا تھے۔ مشہور ہے کہ اگر اُن کو پتہ چل جائے کہ (مثالاً) فلاں ٹرین سے شکیل بدایونی بھساول سے گزر رہے ہیں تو وہ بھساول ریلوے اسٹیشن پر ناشتے دان کے ساتھ شکیل صاحب سے ملاقات کرتے تھے۔ اُن کا یہ حسنِ سلوک صرف شکیل بدایونی جیسے مشہور شاعروں کے ساتھ نہیں تھا، اس سلوکِ عباسی کا راقم الحروف شاہد ہی نہیں بلکہ ان کا نمک خوار بھی رہا ہے۔ رشید عباس سے ہمیں انجم رومانی (اُردو ٹائمز۔ ممبئی) نے متعارف کروایا تھا اور پھر یہ تعارف چالیس سالہ تعلقِ خاطر میں تبدیل ہو گیا۔

وہ زبان و بیان پر قدما کی طرح سلیقے کے ساتھ خوب قدرت رکھتے تھے۔ اخبارات اور رسائل میں ان کے اکثر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ افسوس ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ رشید عباس کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں، سنیچر یعنی 20 دسمبر کو ان کا جسدِ خاکی بعد نماز ظہر بھساول میں سپرِ دِلحد کیا گیا۔ ♦♦

(تحریر: ندیم صدیقی، ممبئی)

شیوراج پاٹل (سابق مرکزی وزیر)

کانگریس کے سینئر رہنما اور سابق مرکزی وزیر داخلہ شیوراج وشواناتھ پاٹل کا جمعہ 12 دسمبر 2025 کو 90 برس کی عمر میں لاتور (مہاراشٹر) میں واقع ان کی رہائش گاہ 'دیوگھر' میں انتقال ہوگیا۔ پاٹل نے لوک سبھا کے دسویں اسپیکر کے طور پر خدمات انجام دیں اور مرکزی کابینہ میں کئی کلیدی محکموں کی ذمہ داری نبھائی۔

شیوراج پاٹل 12 اکتوبر 1935 کو ریاست حیدرآباد (دکن) کے چاکور گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی میں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ممبئی یونیورسٹی سے قانون میں ماسٹر ڈگری مکمل کی اور مختصر مدت تک لاتور میں وکالت بھی کی۔ ان کے سیاسی سفر کا آغاز 1967 میں ہوا، جب وہ لاتور میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ 1972 تا 1980 وہ مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ اس دوران میں مختلف اہم ذمہ داریاں بشمول نائب وزیر برائے قانون وانصاف، آبپاشی اور پروٹوکول نبھاتے رہے۔ 1972 میں وہ متفقہ طور پر ڈپٹی اسپیکر، 1978 میں اسپیکر منتخب ہوئے، جہاں ان کا متوازن اور اصولی انداز قابلِ تحسین رہا۔

شیوراج پاٹل نے 1980 میں قومی سیاست میں قدم رکھا اور سات مرتبہ لگاتار لاتور لوک سبھا سیٹ جیتنے کا منفرد ریکارڈ قائم کیا (1980 تا 1999)۔ اسی برس انہیں وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے وزیر مملکت برائے دفاع مقرر کیا، بعد ازاں انہوں نے تجارت، سائنس وٹکنالوجی، ایٹمی توانائی، الکٹرانکس، خلائی تحقیق اور سمندری ترقی جیسے بڑے مرکزی محکموں کی ذمہ داری سنبھالی۔ راجیو گاندھی کی کابینہ میں بھی انہیں کئی حساس قلم دان دیے گئے۔ 1980 کی دہائی میں وزیر دفاع بنائے گئے جبکہ 1989 میں کانگریس کے اپوزیشن میں آنے کے بعد وہ نویں لوک سبھا کے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوئے۔

2004 میں ان کو بی جے پی کی امیدوار روپا تائی پاٹل نلنگیکر سے شکست ہوئی تھی۔ شیوراج پاٹل کو جولائی 2004 میں راجیہ سبھا کا ممبر منتخب کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ وزیر داخلہ کے اہم حساس عہدے پر فائز کیے گئے۔ ممبئی بلاسٹ کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے 2008 میں شیوراج پاٹل نے وزیر داخلہ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جبکہ 2007 میں شیوراج پاٹل کو صدر جمہوریہ ہند کے امیدوار کے طور پر سامنے لایا گیا تھا۔ لیکن بائیں بازو کی مخالفت کے سبب محترمہ سونیا گاندھی نے اس وقت کی گورنر راجستھان پرتبھا پاٹل کو صدر کے امیدوار کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ ♦♦

مارک ٹلی (سینئر صحافی بی بی سی لندن)

سینئر صحافی اور معروف مصنف مارک ٹلی (Mark Tully) کا اتوار 25 جنوری 2026 کو نئی دہلی کے میکس ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 90 برس تھی۔ وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھے۔

سر ولیم مارک ٹلی 24 اکتوبر 1935 کو کولکاتا میں پیدا ہوئے۔ وہ چار سال کی عمر میں دارجلنگ کے ایک برٹش بورڈنگ اسکول میں داخل کیے گئے۔ 9 سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے ان کو برطانیہ بھیج دیا گیا۔ کیمبرج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مارک ٹلی نے چرچ آف انگلینڈ میں پادری بننے کی خواہش ظاہر کی لیکن لنکن تھیولوجیکل کالج میں دوسمسٹر کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔

مارک ٹلی 22 برسوں تک بی بی سی نئی دہلی کے بیورو چیف رہے۔ بی بی سی ریڈیو 4 کے مشہور پروگرام Something Understood کی پیش کش انہی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ جولائی 1994 میں استعفیٰ دینے سے قبل مارک ٹلی نے 30 سال تک برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن (BBC) کے ساتھ کام کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے تمام بڑے واقعات کی کوریج کی جن میں بھوپال گیس سانحہ، آپریشن بلو اسٹار اور بابری مسجد کی شہادت کے واقعات شامل ہیں۔

مارک ٹلی کی چند کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

1. Amritsar: Mrs Gnadhi's Last Battle (1985)
2. No Full Stops in India (Journalistic Essays, 1988)
3. Upcounty Tales: Once Upon A Time in the Heart of India (Short Stories, 2017)

مارک ٹلی نے 1960 میں مارگریٹ سے شادی کی تھی جن سے چار بچّے ہیں۔ 1981 میں ان کی زندگی میں ایک گرل فرینڈ کا اضافہ ہوا۔ اس کا نام Gillian Wright تھا۔

معروف صحافی سعید نقوی 'خراج عقیدت' کے طور پر اپنی تحریر (انقلاب، 31 جنوری 2026) میں لکھتے ہیں:

''مارک ٹلی اور بی بی سی ریڈیو کا رشتہ برصغیر میں ایک گہرا اور اعتماد سے بھرا تھا۔ ایک انتخابی سروے کے دوران مارک، وقار احمد اور مارک کے نائب ستیش جیکب ایک گاؤں میں گئے، جہاں ایک بوڑھے شخص سے سوال کیا۔ 'ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آپ اور آپ کے گاؤں والے کس امیدوار کو ووٹ دیں گے؟'

بوڑھا شخص کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔

'میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا جب تک بی بی سی نہ سن لوں۔'

اس نے اپنے ٹرانسسٹر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ کشمیر میں مارک کی روانگی پر ایک گہرا ردعمل ہوگا۔ وہاں کے لوگ بی بی سی کو واحد قابل اعتماد ذریعہ سمجھتے تھے۔'' ♦♦

قیوم کنول (شاعر و ادیب)

معروف شاعر، ادیب اور صحافی قیوم کنول کا جمعہ 30 جنوری 2026 کو طویل علالت کے بعد احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کا شمار گجرات کے ممتاز جدید شعرا میں ہوتا تھا۔

قیوم کنول کا تعلق اتر پردیش کے فتح پور سے تھا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں وہ احمد آباد آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ادب کی جانب ان کا رجحان بچپن سے تھا۔ انہوں نے معاشی تگ و دو میں مزدوری بھی کی اور مشق سخن بھی جاری رکھا۔ 1980 کے بعد ایک سہ ماہی رسالہ 'ذخیرہ' جاری کیا تھا۔ لیکن مالی بحران کے سبب یہ رسالہ صرف تین سال تک جاری رہ سکا۔ یہ رسالہ معیاری خیال کیا جاتا تھا جس نے گجرات کی ادبی صحافت کو جدید رنگ دینے کی کوشش کی۔ وہ بطور صحافی ایک عرصے تک 'انقلاب' سے بھی وابستہ رہے۔

قیوم کنول کا پہلا شعری مجموعہ 'سنگ و گل' بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد 'اپنا اپنا رنگ' اور 'دوپہر کی دھوپ' کے نام سے دو مزید شعری مجموعے شائع ہوئے۔ تینوں شعری مجموعے کو گجرات اردو ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے گجرات اردو ساہتیہ اکادمی نے 'گورو پُرسکار' سے بھی نوازا تھا۔ ♦♦ (بشکریہ صدرائے انصاری، دہلی)

سیّد صادق رضوی (شاعر اہل بیت)

شاعر اہل بیت سید صادق رضوی پیر 9 فروری 2026 کو ممبئی میں رحلت کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔

سید صادق حسن رضوی ممبئی ہی میں 23 جون 1946 کو علم و فلم سے تعلق رکھنے والے ایک معزز خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والدِ محترم سید منظور حسن (رضوی) ممبئی کے دورِ قدیم کے ایک اسکول میں درس و تدریس کی خدمات پر مامور تھے، آرزو اسکول کے ممتاز شاعر و عالم محمود سروش (محمود حسن رضوی)، ممبئی کے مشہور 'رضوی بلڈر' اختر حسین رضوی، اور معروف فلم ڈائریکٹر یعقوب حسن رضوی (فلم: بہاروں کی منزل)، صادق حسن رضوی کے برادرِ بزرگ ہیں جن میں سے اختر حسین رضوی ہی اب حیات ہیں۔

صادق رضوی اپنے برادرِ بزرگ محمود سروش سے والہانہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ وہ اپنے شعری کلام میں انہی سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ اپنے بھائی سے محبت اور عقیدت کا یہ عالَم تھا کہ انہوں نے 'بزمِ سروش' کے نام سے ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی، گاہے گاہے جس کی شعری نشستوں سے ان کے گھر میں ایک ادبی رونق رہتی تھی۔

صادق رضوی کا آبائی وطن کراری (الہ آباد) ہے مگر انہوں نے ممبئی ہی میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور اسی شہر (کپاس واڑی شیعہ قبرستان۔ اندھیری) میں آسودۂ خاک بھی ہوئے۔ صادق رضوی کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ ایک بیٹا ساجد رضوی اور بیٹی روحی رضوی ہیں۔

فشارِ خون کی کمی کے سبب صادق رضوی باتھ روم میں گر گئے تھے۔ انہیں ہسپتال کے خصوصی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا جہاں انہوں نے پیر کا دن گزار کر رات آٹھ بجے آخری سانس لی۔

ان کی رثائی شاعری کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:

سیر لالہ زار کی، آہ، خواب زاروں سے پرے اور بارگاہِ جبرئیل ہیں۔

آخری الذکر کتاب، قصائدِ صادق کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اور ڈاکٹر شعور اعظمی کی تقریظات سے آراستہ ہے۔ ♦♦ (مرسلہ ندیم صدیقی، ممبئی)

علی عباس رضوی

(روزنامہ انقلاب کے بزرگ رفیق کارکاتب)

روزنامہ انقلاب (ممبئی) کے بزرگ رفیق کار کاتب علی عباس رضوی جمعہ 6 فروری 2026 کو 97 سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ انقلاب میں ملازمت کے دوران وہ مالونی (ملاڈ) میں مقیم تھے۔ انقلاب کے علاوہ شہر کے کئی رسالوں کی بھی کتابت کرتے تھے۔ انتقال سے قبل وہ ممبرا میں سمیہ اسکول کے پاس اپنی بیٹی کے ہاں رہائش پذیر تھے۔ ان کے جسد خاکی کو ممبرا کے (نزد مٹّل گراؤنڈ) شیعہ قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا۔ ان کے پس ماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔

علی عباس رضوی اتر پردیش کے مشہور ضلع بستی کے قصبہ ہلّور (سادات) میں 15 مئی 1929 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اجداد میں شاہ عبدالرسول تین سو برس قبل مشہد (ایران) سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔

علی عباس رضوی صرف پیشہ ور کاتب نہیں تھے بلکہ وہ بزرگوں کی اخلاقی روایات کے امانت دار بھی تھے۔ ممبئی کے صحافتی اور شیعی حلقوں میں ممتاز عالم دین (مولانا) حسن عباس فطرت کا نام لوگ ابھی بھولے نہ ہوں گے، فطرت مرحوم، کاتب علی عباس رضوی کے حقیقی برادرِ خرد تھے۔ ♦♦

(سینئر صحافی ندیم صدیقی، ممبئی کے طویل مضمون سے ماخوذ)

احمد اقبال (معروف اردو قلم کار)

معروف اردو قلم کار اور مثالی مدرس مولانا آزاد ہائی اسکول، اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے احمد اقبال جمعرات 26 فروری 2026 کو نماز عصر کے وقت انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ گیارہ بجے شب مسجد شاہ گنج میں ادا کی گئی اور تدفین افلاطون مسجد میں عمل میں آئی۔

احمد اقبال 5 نومبر 1940 کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ اورنگ آباد کے مشہور علمی، ادبی اور سماجی شخصیات پر ان کے تحریر کردہ خاکے تین جلدوں میں 'میرا شہر میرے لوگ' کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ ان کی ایک اور کتاب 'گاہے گاہے باز خواں' بھی اشاعت پذیر ہوئی۔

اللّٰہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین! ♦♦

(بحوالہ کاغذ نامہ، گلبرگہ، 26 فروری 2026)

سیّد اعتبار حسین ساجد (شاعر، ادیب و افسانہ نگار)

ممتاز شاعر، ادیب اور افسانہ نگار اعتبار ساجد منگل 27 جنوری 2026 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ ایک عرصے سے گردے کے عارضے میں مبتلا تھے۔

سید اعتبار حسین ساجد یکم جولائی 1948 کو ملتان (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کر کے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے گورنمنٹ کالج نوشکی (بلوچستان) میں لیکچرر رہے۔ اس کے بعد اسلام آباد میں تدریس سے وابستہ ہوئے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں ان کی کتابیں شائع ہوئیں۔ چند تصانیف کے نام یہ ہیں:

دستک بند کواڑوں پر، آمد، وہی ایک زخم گلاب سا، مجھے کوئی شام اُدھار دو (شعری مجموعہ)، راجو کی سرگزشت، آدم پور کا راجہ، پھول سی اک شہزادی، مٹی کی اشرفیاں (بچوں کے لیے کتابیں)۔

اللّٰہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (بحوالہ اعجاز۔ زیڈ۔ ایچ)

پیام سعیدی (شاعر)

اردو کے ممتاز سینئر شاعر پیام سعیدی جمعہ 16 جنوری 2026 کو ممبئی میں انتقال کر گئے۔ ان کے پس ماندگان میں ایک بیٹی اور دو بیٹے شامل ہیں۔

پیام سعیدی کرناٹک کے بھٹکل میں 5 جنوری 1940 کو پیدا ہوئے اور ممبئی میں 1953 سے مقیم تھے۔ وہ اپنے زمانے

کے قوالوں میں بہت مقبول تھے، جن میں یوسف آزاد، جانی بابو اور رانی روپ لتا جیسے گانے والے اور جگجیت سنگھ جیسے مغنّی بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اُس دور کے اکثر مشہور قوالوں کے لیے نغمے لکھے اور ان میں سے اکثر قوالیاں مقبول بھی ہوئیں۔ اُن کا ایک شعری مجموعہ ’الفاظ‘ کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ موصوف شعری مشق اور ریاضت میں خاص درک رکھتے تھے۔ قوالوں میں اُن کی زود گوئی بہت مشہور تھی۔ دور گزشتہ کی ممبئ میں ایک شاعر گزرے ہیں شباب مینائی، یہ مرحوم پیام سعیدی کے خاص دوست تھے۔ شباب مینائی بھی اپنے زمانے کے قوالوں اور گانے والوں میں خاصے مشہور تھے۔ محمد رفیع کی آواز میں ایک نغمہ ہے جو کسی کم سِن روزے دار کی روداد پر مبنی ہے، یہ نغمہ رمضان کے دنوں میں آج بھی سنا جاتا ہے۔ یہ نغمہ انھیں شباب مینائی کا لکھا ہوا ہے۔ شباب مینائی اور پیام سعیدی کی ایک جوڑی تھی جو قوالوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ’ٹی سیریز‘ جیسی مشہور میوزک کمپنی اور دیگر اداروں کے لیے لکھے گئے پیام سعیدی کے نغموں کے کئی البم بھی مقبول ہوئے۔

پیام سعیدی کی بیگم ’کرونا‘ جیسی وبا کے زمانے میں داعئ اجل کو لبیک کہہ چکی ہیں۔ پیام سعیدی پہلے سانتا کروز میں رہتے تھے جہاں اُن کا مکان آج بھی ہے۔ اسی نسبت سے سنیچر (17 جنوری کو) گولی بار (سانتا کروز۔ ممبئ) کے قبرستان میں اُن کے جسدِ خاکی کو سپردِ لحد کیا گیا۔ اس موقع پر موسیقار کلدیپ سنگھ اور ان کے بیٹے جسونت سنگھ، مشہور مغنّی اختر آزاد بھی موجود تھے۔ ◆◆ (مرسلہ ندیم صدیقی، ممبئ)

ڈاکٹر منور عالم (صحافی واستاد ماس کمیونی کیشن)

نوئیڈا (NCR) میں ماس کمیونی کیشن کے استاد ڈاکٹر منور عالم کا جمعہ 16 جنوری 2026 کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 62 سال تھی۔ ان کا تعلق جھارکھنڈ کے رام گڑھ ضلع کے دلمی بلاک سے تھا۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ اور دو بیٹے عمر فاروق اور ابوبکر شامل ہیں۔ دونوں بیٹے حافظ قرآن بھی ہیں۔

ڈاکٹر منور عالم کا تقرر 1992 میں دور درشن پٹنہ کے اردو خبروں کے شعبے میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ دہلی منتقل ہونے سے قبل وہ آکاشوانی پٹنہ اور دور درشن پٹنہ کے اچھے نیوز ریڈر رہے۔ منور عالم سادہ دل اور نرم مزاج انسان تھے۔ تاہم بہتر مستقبل کی غرض سے وہ پٹنہ سے دہلی منتقل ہو گئے تھے۔

منور عالم کی تدفین ان کے آبائی گاؤں دلمی بلاک (رام گڑھ) میں ہوئی۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین! ◆◆

(روزنامہ پندار پٹنہ، 19 جنوری 2026 سے ماخوذ)

اسلم دہلوی (شاعر)

دبستان دہلی کی آبرو اور ٹکسالی زبان کا وقار کہے جانے والے بزرگ شاعر اسلم دہلوی کا تقریباً 80 سال کی عمر میں غالباً منگل 9 دسمبر 2025 کو انتقال ہو گیا۔ انہوں نے مسلسل 6 دہائیوں تک اپنی شاعری کے ذریعہ اردو زبان وادب کی زلف پریشاں کو سنوارنے کا کام کیا۔ مرحوم طویل عرصے سے سانس کے عارضے میں مبتلا تھے اور بعد میں کینسر جیسی مہلک بیماری نے اپنا شکار بنایا، اس کے باوجود مشق سخن جاری رکھی اور ملک و بیرون ملک کے فن شاعری سے شغف رکھنے والے افراد ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ نماز جنازہ کوئیں والی مسجد کے خطیب و امام (مولانا) طالب ندوی نے پڑھائی اور تدفین دہلی کے ویلکم قبرستان میں ہوئی۔ ◆◆

بنگال میں ہندوؤں کی فارسی خدمات
مصنف: پروفیسر سیّد امام الدین
صفحات: 416 (مجلد)، قیمت: -/600، اشاعت: 2025
ISBN 978-93-90579-54-9
زیر اہتمام: اپلائڈ بکس
پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئ دہلی-110002
Tel. 011-44753890 Mob: 9953630788

نئی کتب

NEW ARRIVALS
Classified List

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
اسلامیات: قرآنیات، سیرت، احادیث، فقہ				
خدا کی دریافت (سائنسی حقائق کی...)	مولانا وحید الدین خاں	334	درج نہیں	گڈورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
سیرت النبی (ﷺ)	ڈاکٹر اسرار احمد	400	600/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
قرآن کریم اور علم نباتات (نیا ایڈیشن)	علامہ محمد شہاب الدین ندوی	512	610/-	فرقانیہ اکیڈمی وقف، بنگلور۔ M: 7259900813
مابعد جدیدیت اور اسلام	احمد ندیم گہلن	264	400/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
سماجیات: سائنس، سیاست، تعلیم، میڈیا				
ابن صفی: قارئین کی نظر میں	تنویر اختر رومانی	112	200/-	مصنف، جمشید پور۔ Mob: 7004384853
اسلامی روشن خیالی (ترجمہ)	کرسٹوفر بیلیگ، ترجمہ: ریحان عمر	424	700/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
اوراقِ حکمت	مولانا وحید الدین خاں	232	درج نہیں	گڈورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
اندھیری جیل کا قیدی (بنگلہ دیش...)	بیرسٹر میر احمد بن قاسم ارمان	288+8	750/-	منشورات، نزد منصورہ ہسپتال، ملتان روڈ، لاہور۔
تعمیر شخصیت: کامیاب زندگی کا فارمولا	مولانا وحید الدین خاں	496	——	گڈورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
خدا فلسفیوں کی نظر میں	وحید عشرت	888	1300/-	دانیال پبلی کیشنز۔ Mobile: 7007892005
دی پاور آف ڈسپلن (ترجمہ)	ڈینئل والٹر، ترجمہ: ابن آس محمد	176	300/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
زوال اُمّت: جہات، اسباب اور تدارک	محمد مشتاق احمد فلاحی	432	600/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
فلسفہ وحدت الوجود	وحید عشرت	631	1000/-	دانیال پبلی کیشنز۔ Mobile: 7007892005
کامیاب خاندانی زندگی (رہنما اصول)	مولانا وحید الدین خاں	152	——	گڈورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
کلیات ڈیل کارنیگی	ڈیل کارنیگی	مکمل سیٹ	1500/-	فرید بک ڈپو (پ) لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی-2
للرجال فقط (مرد اور عورت کے تعلقات)	ادھم شرقاوی، ترجمہ: انس ابوہریرہ	230	300/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
شخصیات: تاریخی، دینی، علمی، ادبی				
بہار کے فارسی اساتذہ	رضوان اللہ آروی	384	500/-	رضوان اللہ آروی، پٹنہ۔ Mob: 9430222372
تلوک چند محروم: شخصیت... (ہندی)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد/ مکتالال	322	350/-	ساؤتھ ایکسٹینشن ا، نئی دہلی۔ M: 9810129749
مولانا ابوالکلام آزاد	سہیل انجم	132	160/-	قاضی پبلشرز، نئی دہلی۔ Mob: 9315173399
یادیں جگن ناتھ آزاد کی (1918-2004) [ہندی]	مکتالال	392	425/-	J-30، گراؤنڈ فلور، ساؤتھ ایکسٹینشن ا، نئی دہلی-49
ادب: انٹرویوز/آپ بیتی/سفرنامہ/خطوط				
رہ نوردِ شوق (دعوتی سفرنامہ)	سمعان خلیفہ ندوی	384	400/-	مکتبہ حرا، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
فسانہ بنے گا کل... (سوانح)	عبدالصمد	192	300/-	کتاب دار، ممبئی 8۔ موبائل: 98693321477
ہم تلخی کلام پہ مائل ذرا نہ تھے (محمد حسن...)	ڈاکٹر جمیل اختر	184	349/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
یہ میں ہوں (خودنوشت سوانح)	ف۔س۔اعجاز	264	600/-	انشا پبلی کیشنز، B-25 زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-73

ادب: تحقیق و تنقید/لسانیات/نصابیات

ابرار فائق: ایک قلندر مزاج شاعر	پروفیسر محمد نعیم فلاحی	176	300/-	اپلائڈ بکس، نئی دہلی 2۔موبائل:9953630788
اردو کا مسافر سلطان اختر	مرتب: ش۔شکیل	112	100/-	ش۔شکیل، اورنگ آباد۔Mob: 9529077971
اکبرالٰہ آبادی: اپنی شکست کی آواز (نیا ایڈیشن)	اسیم کاویانی	318	500/-	اسیم کاویانی، ممبئ 10۔موبائل:9322154702
افکار و اطوار (عطا عابدی کے مضامین)	مرتب: ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ	288	350/-	بک امپوریم، پٹنہ 4۔موبائل:9798909392
جہاتِ تفکر (فکر انگیز مضامین)	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	352	400/-	ملت پبلی کیشنز، بجنور۔Mob: 9897334419
شرح و بسط (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	تنویر اختر رومانی	160	300/-	مصنف، جمشید پور۔Mob: 7004384853
عصمت چغتائی کا افسانوی فن	ڈاکٹر محمد دانش غنی	224	300/-	ثنا پبلی کیشنز، ناگپور۔Mob: 9595559073
مبادیات لسانیات	پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ	140	250/-	EPH، D1/16 انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-2
متفرق اوراق	ڈاکٹر سید احمد سندیلوی	262	250/-	435/330 ٹھاکر گنج، لکھنؤ۔M: 9455551607
معاصر نعت کے فکری ابعاد (مضامین)	غلام مصطفیٰ دائم	128	900/-	نعت ریسرچ سنٹر، گلستانِ جوہر، کراچی (پاکستان)
مقالات فضیل احمد قادری	سیّد حسن عباس	278	300/-	سیّد حسن عباس، وارانسی۔Mob: 9839337979
نعتیہ شاعری کا ہیئتی و متنی مطالعہ	ڈاکٹر عزیز احسن	368	2000/-	نعت ریسرچ سنٹر، گلستانِ جوہر، کراچی (پاکستان)
قرۃ العین حیدر (تفہیم کے متنوع زاویے)	جمیل اختر	256	200/-	جمیل اختر، علی گڑھ۔موبائل:9818318512
ہند و ایران کے لسانی رشتے	ڈاکٹر زہرہ خاتون	312	400/-	اپلائڈ بکس، نئی دہلی۔Mobile: 9953630788

ادب: افسانے/ناول/خاکے/طنز و مزاح/انشائیے/ڈرامے

بس پچیس لفظ (پچیس لفظی کہانیاں)	احمد بن نذر	125	225/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔Mob: 7007892005
بے محاورہ (عالمی اردو افسانچے)	ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، مظاہر حسین	352	800/-	ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، رامپور۔M: 9520576079
جرم کا زینہ (جاسوسی ناول)	تنویر اختر رومانی	120	200/-	مصنف، جمشید پور۔Mob: 7004384853
ستاروں میں سوراخ (ناول)	انل پربھا کمار/ آفتاب احمد	184	300/-	کتاب دار، ممبئ 8۔موبائل:9869321477
ق (ناول)	عبداللہ وسیم	270	320/-	مکتبہ حرا، لکھنؤ۔Mob: 7007892005
کوچہ عزیزان (خاکے)	ڈاکٹر انیس صدیقی	140	300/-	محبانِ اردو، گلبرگہ۔Mob: 9342353312
گل افشانیاں (انشائیے)	فرزانہ فرح	144	275/-	محبانِ اردو، گلبرگہ۔Mob: 9886571233

تاریخ و تذکرہ

بیت المقدس اور فلسطین (حقائق و...)	عنایت اللہ وانی ندوی	256	260/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔Mob: 7007892005
تحریک اسلامی کی پُرعزم خواتین	ڈاکٹر خان مبشرہ فردوس	312	230/-	MMI پبلشرز، نئی دہلی ۲۵۔M: 7290092403
فلسفہ مغرب کی تاریخ	برٹرینڈ رسل	980	1500/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔Mob: 7007892005
گلبرگہ کے ادب ساز	ڈاکٹر انیس صدیقی	352	400/-	انجمن ترقی اردو ہند (شاخ گلبرگہ)، گلبرگہ-585102
الوثائق السیاسیہ	ڈاکٹر محمد حمید اللہ/ سیّد عزیز الرحمٰن	664	800/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔Mob: 7007892005

شعری ادب

جمالیات (کلام جمال صابری)	مہر عالم خان	312	499/-	ریختہ پبلی کیشنز، B-37 سیکٹر 1، نوئیڈا-201301
رحمت للعالمین ﷺ (نعتیہ کلام)	ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن	144	250/-	شاعر سے رابطہ:9449202211
سیّارہ کی منتخب نعتیں	ڈاکٹر طاہرہ انعام	136	900/-	نعت ریسرچ سنٹر، گلستانِ جوہر، کراچی (پاکستان)
نسبت (2026، اضافہ شدہ ایڈیشن)	سیّد محمد ابوالخیر کشفی	136	900/-	نعت ریسرچ سنٹر، گلستانِ جوہر، کراچی (پاکستان)
نوائے رنگ (متنوع نظمیں)	وشال کھلّر	222	800/-	وشال کھلّر، لدھیانہ۔Mob: 9463681801

[باقی صفحہ 73]

قوم کے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات سے خصوصی اپیل

یتیم خانہ اسلامیہ گیا

آپ کے مالی تعاون کا منتظر ہے۔

109 سالہ خدمات

تعارف ادارہ کی بنیاد اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایک استاد اور دو یتیم بچوں سے آٹھ آنے (50 پیسے) ماہوار کرایہ کوٹھری میں (Rs. 30/=) روپے کی چھوٹی سی رقم سے پڑی تھی۔ **تعلیمی سال** اپریل تا مارچ **تعلیمی مراحل** ● ابتدائی ● ثانوی ● اعلیٰ ● شعبۂ حفظ و ناظرہ ● عنایت (I.T.I) ● پانچ زبانوں میں تعلیم ● عربی، اُردو، فارسی، ہندی، انگریزی وغیرہ ● تعداد زیر تعلیم طلباء و طالبات: تقریباً 450 ● **تعداد کل یتیم طلبا** 60 ● بیرونی طلباء جو اپنا خرچ دے کر ہوسٹل میں رہتے ہیں علاوہ ہیں۔ ● تعداد تدریسی و غیر تدریسی اسٹاف: 28 **سالانہ خرچ** چالیس لاکھ (Rs:40,00,000) روپے سے زائد۔ **ذریعہ آمدنی** مسلم عوام کے چندے۔ **اخراجات** یتیم طلباء کا سارا خرچ مع طعام و قیام و رہائش وغیرہ بالکل مفت (Free)۔ یہ سارا خرچ ادارہ پورا کرتا ہے۔ کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ **یاد رکھیں** 1 یہاں کا کوئی بھی محصل کمیشن (اجرت) پر چندہ وصول نہیں کیا کرتا ہے۔ 2 پانچ زبانوں میں مع قرآن و اسلامیات کے ساتھ درجہ اول تا میٹرک (Matric) تک جو (بہار بورڈ سے منظور شدہ ہے) معیاری تعلیم ہے۔ ● حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک (X) کا نظم 3 109 سال سے یتیم اور غیر یتیم طلباء کی اسلامی ماحول میں دینی و عصری تعلیم کے ساتھ تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ 4 ادارہ ہی کے احاطے (Campus) میں دو ہرے بھرے پارک کے ساتھ شاندار مسجد، تعلیم گاہ اور اقامت گاہ، مطبخ اور دوسرے شعبہ جات وغیرہ۔ ● اس لئے طلباء کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا ہے۔ **کفالہ اسکیم (Sponsorship)** کے تحت ایک یتیم طالب علم کا سالانہ خرچ : تیس ہزار (Rs:30,000) روپے ہے۔ آپ بھی اس کار ثواب میں شریک ہوں۔ ● یہاں کے طلبا کو میٹرک (Matric) پاس کرنے کے بعد کالج کے علاوہ عربی یونیورسٹی میں عالمیت کے سال اوّل و دوم میں بآسانی داخلہ مل جاتا ہے۔ 5 یتیم خانہ سے میٹرک (Matric) پاس کرنے والے یتیم طلباء کا داخلہ یتیم خانہ کے عنایت (I.T.I) میں بالکل مفت (Free) ہے۔ ان سے کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ پہلے کی طرح رہنے سہنے اور کھانے پینے کی ساری سہولیات دی جاتی ہے۔ **اپیل** اس مادہ پرستانہ اور جدید دور میں دینی و عصری علوم کے رہائشی (Residential) اداروں کی پہلے سے آج کہیں بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ● آپ اس ہوش ربا گرانی میں اور اس رمضان المبارک کے موقع پر ادارہ کی بھرپور مالی مدد کریں۔ تعاون کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ● زکوٰۃ ● عطیات ● صدقات وغیرہ اور ادارہ کے باقی تعلیمی و تعمیری منصوبوں کے لئے بھی روپے کی بہت ضرورت ہے۔ ادارہ آپ سے ننھے منے معصوم یتیم بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ باہنر بنانے کے لئے اور انہیں اونچا اٹھانے کے لئے فراخدلانہ مالی تعاون کی اپیل کرتا ہے۔

نوٹ ادارہ کی مختصر تاریخ دستاویزی (Documentary Film) فلم نذر عنایت (Nazr-e-Enayeth) You Tube پر دیکھیں۔

چیک ڈرافٹ اور کور بینکنگ سلپ پر صرف یہ لکھیں : **THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE**

برائے رابطہ ڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ ● Hon. Secretary, THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE

Cherki-824237, Distt: Gaya (Bihar) India : **9801213022, Whatsapp No. 7258063440**

Beneficiary Name: THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE

Bank A/C No.: 300402010010581 (Zakath) زکوٰۃ

Bank A/C No.: 300402010002982 (Donations) عطیات وتعمیرات

Bank IFSC Code No.: UBIN0530042

Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH GAYA)

Scan to Pay

یاد رکھیں بینک میں رقم ٹرانسفر کی تفصیل۔ برائے مہربانی اسکین اینڈ پے (Scan & Pay) یا کسی ذریعہ سے رقم ٹرانسفر کے بعد اسکرین شاٹ (Screen Shot) مع نام و پتہ اوپر کے وہاٹس ایپ نمبر پر وہاٹس ایپ کردیں تاکہ رسید بھیجی جاسکے۔

انجینئر محمد حسنین خاں۔ صدر : **9631867066** ڈاکٹر زیڈ۔ ایچ۔ خاں۔ اعزازی سکریٹری

● E-mail: gmocde@yahoo.com.in ● Website: www.gmogaya.in ●

پٹنہ برانچ آفس پٹنہ شہر کے ہمدردان یتامیٰ اپنا چیک ڈرافٹ اور رقم دینے کے لئے ان سے رابطہ قائم کریں۔

جناب غلام محمد خاں۔ سمن پورہ، پٹنہ۔: **9934943229** جناب انجینیر محمد حسنین خاں۔ سمن پورہ، پٹنہ۔: **9631867066**

URDU BOOK REVIEW QUARTERLY
NEW DELHI-110 002
Ph.: (Office) 011-44753890, Mobile: +91-9953630788

R.N.I. No. 63106 / 95
VOL. XXXII ISSUE NUMBER - 45
January, February, March - 2026

SILVER JUBILEE YEAR 2015 · ALL INDIA UNANI TIBBI CONGRESS · REGISTERED ON 9th AUGUST 1990

’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘

فروغِ طب کی ایک مکمل تحریک ہے آپ بھی ممبر بن کر اس تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں!

ممبرشپ حاصل کرنے کے لیے دوعدد فوٹو، ووٹر آئی ڈی یا آدھار کارڈ کی فوٹو کاپی اور ایک ہزار روپے کا ڈی ڈی کسی بھی بینک سے

"ALL INDIA UNANI TIBBI CONGRESS"

کے نام بنواکر مرکزی دفتر ’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘ کو رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کریں۔

درج ذیل اکاؤنٹ میں آن لائن ٹرانسفر بھی کر سکتے ہیں:

Current A/c No. 200110100034672 IFSC: BMCB0000044
Bombay Mercantile Co-Operative Bank Ltd., Branch: Darya Ganj, New Delhi-2

Scan & Pay

مرکزی دفتر

آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس

D-49، نیو سیلم پور، نزد شہید اشفاق اللہ خاں پارک،
دہلی-110053

Branch Office

SADAR UNANI CLINIC
3546, Behind Sablok Clinic, Darya Ganj, New Delhi - 110002
Tel.: 011-47524630 / 9810429359 / 7893246825
E-mail: aiutcongress@gmail.com, mahmad1952@yahoo.com
Website: www.aiutc.com

ISSN 0971-9288

Printed, published and owned by **Mohammad Arif Iqbal**, Printed at Asila Offset Printers, 1307-08, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-2 and published from 1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-110002 *Editor :* **Mohammad Arif Iqbal**